TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222507
UNIVERSAL LIBRARY

اُردو مرکز لائبریری

اُردو ادب کے جاں فروز مرثیوں کا علمی انتخاب

پیامِ زندگی

جلد اوّل

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
(اقبال)

مرتّبہ

مولینا تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر اتحاد

بہ اعانت

حضرات اراکین اُردو مرکز لاہور

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلیشرز لاہور

اس سے بددل ہوکر اُسے قطعاً ناقابلِ توجہ سمجھنے لگا دوسری طرف ایک جماعت ایسی ہے جو اپنی ملکی زبان اور وطنی انشا و ادب سے والہانہ جوش میں اُس کی انتہائی حمایت پر آمادہ ہے لیکن زندگی کے دیگر مشاغل اور اُس کی شدید مصروفیتوں کے باعث اُسے اتنی فرصت نہیں کہ اس تمام ذخیرۂ خس و خاشاک سے کارآمد و جاندار حصے کو الگ کر کے اردو ادب کی حقیقی قدر آشنا ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج موافق و مخالف دونوں اس کی قدر و قیمت کے اصلی اندازے سے محروم ہیں۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ اردو کو تہی مایہ اور بے بضاعت کہنا ایک طرح پر فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ یونیورسٹیوں ٹیکسٹ بک کمیٹیوں اور کونسلوں وغیرہ میں بھی وقتاً فوقتاً اور موقع بے موقع اس کی تہی مائگی اور بے بضاعتی کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت آشنا اصحاب اس خیال سے کبھی متفق نہیں ہوئے۔ جن لوگوں نے اردو کی فہرستہائے کتب پر کبھی نظر ڈالی ہے اور لائبریریوں میں جا کر نادر الوجود قلمی و مطبوعہ نسخوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو زبان ایک بحرِ بیکراں ہے جس کا دامن تابدار موتیوں کا ایک سیر حاصل جلوہ زار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو ادبیات کا دامن رطب و یابس کے بدنما داغوں سے کلیتہً پاک نہیں لیکن یہ عیب دنیا کی اُن ترقی یافتہ زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو فی زمانہ علمی زبانیں کہلاتی ہیں اگر اردو میں پست و پامال لٹریچر کی اشاعت بڑی کثرت و سرعت سے ہو رہی ہے۔ تو انگریزی میں بھی چار چار آنے کے ناول لکھنے والے مصنفین کی تعداد

کسی طرح کم نہیں۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی تصانیف بلا استثنا مبتذل اور سوقیانہ انداز کی ہوتی ہیں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہاں انگریزی لٹریچر کی فضیلت کے ثبوت میں ملٹن۔ شیکسپیئر۔ شیلے۔ ورڈسورتھ۔ جانسن میکالے اور رائڈر ہیگرڈ وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں وہاں اردو ادبیات کی محفل بھی میر و غالب۔ انیس اور دبیر۔ حسن اور نسیم۔ داغ اور حالی۔ آزاد اور نذیر احمد۔ سرشار اور شرر۔ سرسید اور شبلی۔ اکبر اور اقبال جیسی بلند پایہ شخصیتوں سے خالی نہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ اردو حکمران قوم کی زبان نہ ہونے کے باعث اُس قدر دانی سے محروم ہے جو ہندوستان کے بیس کروڑ باشندوں میں تبادلۂ خیالات کے آسان ترین وسیلہ کی حیثیت سے اُس کا جائز حق ہونا چاہیئے۔ مگر اس کی بے بضاعتی کا رونا اُس کی اور اُس کے اہلِ قلم کی ناقدری سے زیادہ اُن مفروضہ اثرات پر مبنی ہے جو کسی چیز کی ناقدری اور کس مپرسی کے قدرتی عواقب سمجھے جاتے ہیں اور اِس سے بھی زیادہ اِس کا محرک یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اردو کو بے مایہ اور تہی دامن نہ کہا جائے گا۔ تو کہنے والے کی ہمہ دانی۔ وسعتِ مطالعہ بلکہ خوش مذاقی پر بھی حرف آئے گا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اردو نے اِس کس مپرسی کی حالت میں بھی جملہ مراحلِ ارتقا کو حیرت آفریں سرعت سے طے کیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ خداداد اہلیت اپنے اظہار کے اسباب خود مہیا کر لیتی ہے یہ ناقابلِ انکار صداقت ہمیشہ کے لئے مستور نہیں رہ سکتی کہ رہا بہ ایں بس

کے اِس انبار اور خس و خاشاک کے اِس ذخیرہ میں جو آجکل اصطلاحِ عامہ میں اردو لٹریچر کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر مسالہ موجود ہے کہ اگر اُس کی طباعت کا انتظام مناسب اہتمام کے ساتھ کیا جائے تو ممتاز سے ممتاز لائبریریوں کی زینت میں گرانبہا اضافہ ہوسکتا ہے۔ اُردو مرکز کے سلسلے میں ہمیں اُردو لٹریچر کے وسیع مطالعہ سے جو تجربہ ہوا۔ اُس کی بنا پر علیٰ رؤسِ الاشہاد ہم یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ اردو لٹریچر کے منتخبات سے یونیورسٹی کے تمام اعلیٰ مدارج کے لئے کورس تیار ہوسکتے ہیں۔

"خدمتِ زبان" اور "خدمتِ ادب" کی جو صدا تمام طول وعرضِ ہند میں گونجی ہوئی ہے اور ملک کے بہتر سے بہتر دل و دماغ اِس کے لئے جس طرح وقفِ کاروجد وجہد ہیں اِس میں شک نہیں کہ وہ بہت اُمید افزا ہے مگر اسی کے ساتھ ہم اِس اظہارِ خیال سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی منازل سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ طبقاتِ علمی کے لئے جب تک اردو ادب کے ایسے منتخب نمونے (جو ہمارے پست دورِ زندگی کے زہر آگین عناصر سے بالکلیہ پاک ہوں) کی ترویج و اشاعت کا انتظام نہ کیا جائے گا اور اِس طرح ملک میں جب تک ایک اعلیٰ اور صالح ذہنیت و صلاحیت نہ پیدا کی جائے گی اُس وقت تک "خدمتِ اردو" کے سلسلے میں ہماری بڑی سے بڑی سعی بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ بار آور نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ہم کامل یقین و وثوق کے ساتھ یہ خیال رکھتے ہیں کہ اردو اور اُس کی ادبی خدمات کے

ضمن میں سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ایک ایسا سلسلۂ مجلدات تیار کیا جائے جسے حقیقی معنوں میں اپنا لٹریچر کہتے ہوئے ہم کوئی ندامت نہ محسوس کر سکیں۔ اِس قسم کے منتخب لٹریچر کی اشاعت سے نہ صرف یہ کہ اُردو میں ایک مخصوص تابناک دورِ حیات کا آغاز ہو گا بلکہ اِس سے ہماری آئندہ نسلیں ادبی گمراہیوں سے محفوظ رہ کر ایک اعلیٰ ذہنیت اور معقول صلاحیتِ علمی کی بھی حامل ہو سکیں گی۔

"ایک اچھی لائبریری ایک ارزاں یونیورسٹی ہے"

یہ کسی یوروپین مصنّف کا قول ہے جس کی بلیغ معنویت اپنے اجمال و ابہام میں بھی کسی مزید تفصیل و توضیح کی محتاج نہیں۔ اردو مرکز کے اُن مقاصدِ عالیہ میں جو اردو مخزن العلوم کی تدوین اور اردو زبان کے دارالافتا کی تنظیم پر مشتمل ہیں اردو ادب کے نادر و کار آمد حصّے کا تحفّظ بھی داخل ہے چنانچہ مذکورہ خیالات کی بنا پر اُس نے اپنے لائحہ عمل کی اوّلین دفعہ یہی رکھی ہے کہ اردو زبان نے اپنی موجودہ مدّتِ حیات میں جو صالح اور جاندار ذخیرۂ ادب تیار کیا ہے اُسے مسلسل مجلّدات میں ترتیب دے اور اِس طرح اُس یوروپین مصنّف کے مذکورۂ بالا قول میں خفیف سی ترمیم کر کے

"ایک اچھی یونیورسٹی ایک ارزاں لائبریری کی شکل میں"

ملک کے سامنے پیش کر دے۔

تجاویز اور "اسکیم بازی" خوش فکر دماغوں کا ایک "عملِ تعیّش" ہے اصل سوال "ہو تو کیونکر ہو" کا ہے۔ اِس لیئے ہم نے سب سے پہلے نہ ۔ کے

بعض مشاہیر سے اُس باب میں استمزاج کیا۔ اردو مرکز کے نمائندگانِ خصوصی نے زحمتِ سفر برداشت کر کے بعض بزرگوں سے بالمشافہ گفتگو کی اور طریقِ انتخاب و طریقِ کار کے متعلق اُن سے نہایت مفید مشورے بھی حاصل کئے اُن بزرگوں میں سے مندرجۂ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں:۔

علامہ[1] عبدالحلیم شرر مرحوم۔ ڈاکٹر سر محمد[2] شفیع بیرسٹر ایٹ لاء کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ علامہ عمادی[3]۔ مولینا عبدالماجد[4] بی۔ اے مصنف فلسفہ جذبات و فلسفہ اجتماع۔ پروفیسر[5] رشید احمد صدیقی ایم۔ اے لکچرار مسلم یونیورسٹی و مدیر سہیل علیگڈھ۔ مولینا[6] سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم لکھنؤ۔ ڈاکٹر[7] شانتی سروپ ایم۔ ایس۔ سی۔ ڈی۔ ایس۔ سی یونیورسٹی پروفیسر مولینا[8] سید راشد الخیری دہلوی ایڈیٹر رسالہ عصمت دہلی۔ مولینا[9] وحیدالدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی۔ ڈاکٹر[10] خلیفہ عبدالحکیم ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی۔ مولینا سالک[11] ایڈیٹر انقلاب۔ مولینا[12] خلیقی دہلوی۔ خواجہ[13] دل محمد صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لنڈن) پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور۔ مرزا اعجاز حسین دہلوی بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل مولینا سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل۔ پروفیسر کشوری موہن مترا۔ ایم۔ اے ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لنڈن)۔ میاں بشیر احمد بی اے آکسن بیرسٹر ایٹ لاء ایڈیٹر ہمایوں۔ چودھری فتح دین صاحب ایم اے ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن۔ مولینا سید ناصر نذیر فراق دہلوی۔ چودھری محمد حسین صاحب

بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس۔ ڈی۔ آئی منٹگمری۔ شیخ ظہور الدین صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس۔ ڈی۔ آئی۔ لائل پور۔ خان بہادر مولوی خورشید احمد صاحب بی۔ اے ریٹائرڈ ڈویژنل انسپکٹر راولپنڈی۔ راجہ فاضل محمد خان صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس ڈپٹی انسپکٹر راولپنڈی ڈویژن۔ چودھری غلام رسول صاحب شوق ایم۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس ڈی۔ آئی ڈیرہ غازیخان۔ مولنا حافظ احمد علی خان صاحب منصرم کتب خانہ ریاست رام پور۔ حضرت ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ۔

اس کے علاوہ اور اکثر خوش مذاق حضرات سے جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں تبادلہ خیالات کا موقع آتا رہا مگر مذکورہ اصحاب میں سے خصوصیت کے ساتھ جس نے اردو مرکز کے کاموں سے دلچسپی کا اظہار فرمایا وہ علامہ شرر مرحوم کی ذات تھی۔ موصوف نے نہ صرف یہ کہ طریق کار کے متعلق مشورے عنایت فرمائے بلکہ بعض صحبتوں میں اپنا گراں بہا وقت فراہمیٔ مواد اور مشکلاتِ انتخاب کے حل کرنے میں بھی صرف فرمایا۔ موصوف کا یہ وعدہ بھی تھا کہ آخر جنوری تک لاہور تشریف لاکر اور کچھ دنوں قیام فرماکر اردو مرکز کے کاموں میں اعانت بھی فرمائیں گے مگر افسوس مرحوم کی اچانک موت نے اِن تمام حوصلوں کو بار آور ہونے نہیں دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہم نے اخبارات و رسائل میں اپنی ان تجاویز و عزائم کا کوئی شور نہیں مچایا اِس لئے کہ ع

عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

صرف مخصوص اربابِ قلم کی خدمت میں ایک ایک مطبوعہ تحریر بھیج کر اُن سے مبسّر (مواد) اور مفید مشوروں کی التجا کی تھی۔ اِس تحریر کی نقل بجنسہٖ درجِ ذیل ہے :-

جناب محترم!

یہ امر جناب سے پوشیدہ نہیں کہ ملک کا بہی خواہ اور علم دوست طبقہ ایک مدت سے اردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی سطح پر لانے کے لئے بیقرار ہے۔ اس حیثیت سے موقت الشیوع جرائد و رسائل اور ملک کی چھوٹی بڑی علمی جماعتیں اور انجمنیں جو کچھ کر رہی ہیں اُن کا کافی احترام کرتے ہوئے ہمیں اِس حقیقت کے اظہار بغیر چارہ کار نہیں کہ کام کی اہمیت اِس تنگنائے فکر سے گذر کر مزید وسعتِ عمل کی محتاج ہے "اُردو مرکز" (ملک کی واحد اردو اکاڈمی جو دنیائے ادب کے مشاہیر اہلِ قلم کی گرانقدر مجلس کی نگرانی میں ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے) نے اس امر کو ملحوظ رکھ کر اپنے مجوزہ نظامِ عمل کے لئے حسبِ ذیل دفعات مقرر کئے ہیں :-

(۱) اردو کے اُس حصّۂ ادب و شاعری کو (جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے اور جو درحصل اُس کی آیندہ ترقیات کا اصلی ہیولیٰ بھی ہے جلد سے جلد انتخاب کے بعد مستقل مجلّدات کی صورت میں ترتیب دینا۔ (۲) اردو میں ایک مخزن العلوم (انسائیکلوپیڈیا) تیار کرنا۔ (۳) اردو زبان کے قدیماتِ ادبیہ کا ایک منتخب مجموعہ سال بسال مجلّدات کی شکل میں پیش

کرتے رہنا۔ (۴) گرانقدر نایاب مطبوعہ وغیر مطبوعہ اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور حسبِ استطاعت ہر قسم کی علمی ادبی اردو تصنیفات و تالیفات کی اشاعت۔ (۵) اردو مرکز کی مجلسِ مشاورۃ (جو بحیثیت اردو زبان کے لئے ایک ادبی دارالافتاء ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع اور متنازعہ فیہ امورِ ادبیہ کے متعلق ناطق فیصلہ۔

اِن دفعات کی اوّلین قسط یہ ہے کہ نظم و نثر کے اِس بہترین حصہ کو جسے اُردو ادب اپنی موجودہ مدّتِ حیات میں فراہم کرسکا ہے ایک باقاعدہ و منتظم صورت میں ملک کے سامنے پیش کردے۔ یہ مجموعہ جہاں ایک طرف اردو ادب شاعری کا حاصل و عطر ہوگا وہیں یہ امر بھی مدِّنظر ہے کہ حتی الامکان اس میں ایک حدِّ خاص تک ترتیب تاریخی بھی ملحوظ رہے تاکہ ہر دور کے خصوصیات اور ادبی دماغ کے ارتقائی مدارج کا بھی سرسری طور پر اندازہ ہوسکے۔ اِس التزام کے ساتھ ساتھ یہ اہتمام بھی پیشِ نظر ہے کہ شعراء اور اُدبار کی تصاویر اور اُن کے حالات سے بھی (جس قدر دستیاب و میسر ہوسکیں) اِن مجلدات کی رونق و زینت میں اضافہ کیا جائے۔ اِن بلند اور وسیع عزائم کی اہمیت اور اِن کے مشکلات کا جناب خود ہی اندازہ فرماسکتے ہیں۔ اُردو مرکز لاہور نے خدا کا نام لیکر اِس کام کو شروع کردیا ہے جسے اربابِ ذوق کی مشہور و قابلِ قدر جماعت نہایت سرعت سے انجام دے رہی ہے

بلکہ اِس کام کا ایک بڑا حصہ پریس میں بھی جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے مشہور فضلا و ادیب بھی اپنے زرّیں مشوروں اور اعزازی خدمات سے اردو مرکز کی اعانت فرما کر خدمتِ زبان کا غیر فانی ثبوت دے رہے ہیں لیکن مشرقی اخلاق و ذہنیت کی ناقابلِ تردید عظمت یہ ہے کہ یہاں کے کاموں کی تمام مشکلات کو صرف سرمایہ و مالیات ہی کے زور پر حل نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ ملک میں بحمداللہ ایسے غیور و عالی حوصلہ بزرگوں کی کمی نہیں جو ملک کے مفید کاموں کی اعانت و حوصلہ افزائی کو مادی "سود و زیان" سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتے اور صرف بے غرضانہ اعانت کو اپنی خدمات کا حقیقی نعم البدل تصور کرتے ہیں۔ نظر بر اں جناب سے بکمالِ ادب گذارش ہے کہ اپنی نظم و نثر کا ایک منتخب اور خوشخط مجموعہ مع اپنے حالات اور بلاک کے (اور اگر بلاک موجود نہ ہو تو تصویر) اردو مرکز انارکلی لاہور کے نام ارسال فرمائیں۔ اسی کے ساتھ ہمارے کاموں کے متعلق اگر کوئی مفید مشورہ بھی عنایت فرمائیں گے تو اُسے بھی نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اردو نظم و نثر کی کوئی ایسی کار آمد تصنیف و تالیف جو اب تک کُنج گمنامی میں پڑی ہوئی ہو اسکے منتخب حصے معہ مصنف یا مؤلف کے حالات کے اگر دستیاب ہو سکیں تو وہ بھی براہِ عنایت ارسال کئے جائیں۔ اِس قسم کی زرّیں امداد دینے والے حضرات کا اس تاریخی سلسلہ میں شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جائیگا۔ اسکے علاوہ

کارکنانِ اُردو مرکز ایسے تمام حضرات سے جنہوں نے اُردو ادب و شاعری کی کوئی خدمت انجام دی ہو یہ امید کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اِس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اس لئے کہ اُن کے حالات اور گرانمایہ کارنامے اگر اُردو ادب و شاعری کے اِس مستقل و مبسوط ریکارڈ اور مخزن میں نہ آئے تو یہ امر بڑی حد تک طرفین کے لئے قابلِ افسوس ہوگا۔ **اَلْمُلْتَمِسْ** مہتمم اُردو مرکز۔ انارکلی لاہور

اِس درخواست پر اطرافِ ملک سے ہماری جس قدر حوصلہ افزائی کی گئی وہ ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ تھی۔ انتہا یہ کہ بعض کرمفرماؤں نے تو اپنے مستقل کارنامہ ہائے علمی ہمیں انتخاب و طباعت کے لئے مرحمت فرما دیئے جن سے گو ہم بقدر ضرورت ہی متمتع ہو سکے تاہم اُن کی مخلصانہ اعانت کے تہ دل سے معترف و سپاس گذار ہیں۔

اُردو ادب اور اُس کا سرمایۂ علمی

ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکنے کے بعد ہم نے پانچ ہزار روپیہ کے صرف سے ایک لائبریری مرتب کی اس میں ہمیں جو دقتیں پیش آئیں وہ بہت صبر آزما تھیں۔ مروجہ کتب کا حاصل کر لینا تو چنداں دشوار نہ تھا کسی مطبع یا کتب خانہ کی فہرست اُٹھائی اور اُس میں سے جو کتابیں مفیدِ مطلب نظر آئیں اُن کی قیمت منی آرڈر کے ذریعے ارسال کر دی۔ لیکن جو نادر الوجود اور عسیر الحصول نسخے ملک کے دُور افتادہ گوشوں میں قدیم مگر گمنام گھرانوں اور

غیر معروف لائبریریوں کے اندر لالۂ صحرا کی طرح اپنی جاں نواز نکہت رائگاں کر رہے ہیں، اُن کے مہیا کرنے میں صرفِ زر سے زیادہ تلاش و تحقیق کی ضرورت تھی بہر حال جہاں سے اور جس طرح جو کتابیں مل سکتی تھیں ہم نے اپنی لائبریری میں جمع کیں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی کل کائنات اتنی ہی نہیں اِس کی گرانبہا متاع وہ علمی مضامین ہیں جو انتہائی تلاش و کاوش سے ملک کے سربرآوردہ اربابِ فکر کے قلم سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں اور جن کے حقیقی سرمایہ دار ہمارے ادبی رسائل ہیں جو ایک مدت سے غیر محسوس طور پر خدمتِ زبان کی انجام دہی میں مصروف ہیں اِن رسائل میں مندرجۂ ذیل خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں:۔

مخزن۔ معارف علیگڈھ۔ معارف اعظم گڈھ۔ اردو (دکن) الناظر لکھنؤ۔ زمانہ کانپور۔ اُردوئے معلّٰی علی گڈھ۔ نگار بھوپال۔ علی گڈھ میگزین۔ ذخیرہ حیدرآباد۔ دکن ریویو۔ ہمایوں۔ بہارستان۔ نیرنگ خیال۔ ہزار داستان دلگداز۔ ادیب الہلال۔ کہکشاں۔ العصر۔ نوید۔ نقاد۔ شمع آگرہ۔ خطیب دہلی۔ تمدّن دہلی۔ کوکب گونڈہ۔ عالمگیر لاہور۔ شبابِ اُردو لاہور نقیب بدایوں۔ دلکش مرادآباد۔ صوفی۔ المعلم (دکن)۔ پیمانہ۔ نورجہاں۔ عبرت۔ زبان۔ قوس قزح۔ مرقع لکھنؤ۔ افادہ آگرہ۔ افادہ حیدرآباد تحفہ حیدرآباد۔ صلائے عام دہلی۔ کمال دہلی۔ زبان اردو لاہور۔ ادیب اُردو لکھنؤ۔ نظارہ میرٹھ۔ نوبہار علیگڈھ وغیرہ۔

مذکورہ رسائل کی ادبی خدمات کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ

ان میں سے تقریباً ہر شعبۂ علم کے متعلق ہم ایک معتد بہ و معقول مواد فراہم کر چکے ہیں اُن میں ہمیں ایسے مضامین بھی ملے جس میں اس حد تک اجتہادِ فکر و دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے کہ ہم اُنہیں اکتشافات و تحقیقاتِ علمیہ کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اخبارات و رسائل پر بیشتر سرسری نظریں پڑتی ہیں اور کسی اچھے سے اچھے مضمون کو بھی دیکھ کر اردو ادب کی مجموعی حیثیت کا بالعموم اندازہ نہیں ہوتا لیکن ان تمام رسائل سے ہر موضوع اور ہر بحث کو اگر علیحدہ علیحدہ بالترتیب جمع کیا جائے تو معلوم ہو کہ اردو ادب کا آج کیا درجہ ہے اور وہ زبان جو محکومیت کے آغوش میں نشو و نما پا رہی ہے آج کس حد تک آزاد ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چلنے کے لئے بیقرار ہے۔

چنانچہ کارکنانِ اردو مرکز نے مستقل تالیفات و تصنیفات کے علاوہ مذکورہ رسائل کے گہرے مطالعہ و انتخاب کے بعد کئی لاکھ صفحات کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اور آج ہم اِس امر کے اعلان کی جسارت رکھتے ہیں کہ تقریباً تمام شعبہ جات علم و ادب پر ہم نے ڈیڑھ سو مجلدات تیار کر لئے ہیں اور جہاں تک حالات مساعدت کریں گے ہم انشاء اللہ بہ اقساط انہیں برابر شائع کرتے رہیں گے۔ ان مجلدات سے نہ صرف یہ کہ ملک میں ایک سنجیدہ و کارآمد لٹریچر کی اشاعت ہو گی بلکہ ایک ایسی مختصر سی لائبریری بھی بآسانی تیار ہو جائے گی جس سے عام مؤلفین و مصنفین بڑے بڑے دفاتر کی ورق گردانیوں سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ آیندہ جس کسی مصنف کو کسی اہم مضمون پر تصنیف و تالیف کی ضرورت ہو گی وہ اُس تصنیف یا تالیف کے متعلق اُردو مرکز کے منتخبات میں ایک

ہی جگہ ضروری مواد فراہم پا کر لائبریریوں میں مہینوں کی تلاش و جستجو اور ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچ جائے گا۔

انتخابِ نظم و نثر کے متعلق ملک کے سربرآوردہ اربابِ فکر کے قیمتی مشورے اور سلیم المذاق کارکنوں کا طریقِ کار اگرچہ کام کی عمدگی کی کافی ضمانت ہے۔ تاہم شروع سے لیکر اخیر تک کمزور انسانوں ہی نے اسے انجام دیا ہے اس لئے اسے "خطا و نسیان" سے کسی طرح مبرا نہیں کہا جاسکتا ابتدائے کار سے لیکر اِس وقت تک ہم نے ہر مشورے کا کافی احترام کیا ہے اور چونکہ یہ کسی فردِ واحد کا کام نہیں ہے اِس لئے قدرتی طور سے بھی ضد و تعصب کی اس میں گنجائش نہیں۔ چنانچہ ہم کامل فراخ دلی کے ساتھ یہ حوصلہ رکھتے ہیں کہ اِن مجلدات کی طباعت و اشاعت کے بعد بھی موافق و مخالف دوست و دشمن کی کسی صف سے جو معقول صدائے اصلاح اُٹھیگی اُس کا کمال مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا جائیگا اور دوسرے اڈیشن میں شکریہ کے ساتھ اُس کی تصحیح و تلافی کر دی جائے گی۔

شعرا و مصنفین کی تصاویر اور اُن کے حالات کی فراہمی میں بھی حتی الوسع ہم نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا مگر جو التزام و اہتمام ہمارے پیشِ نظر تھا وہ افسوس کہ خاطر خواہ انجام نہ پاسکا۔

گذشتہ شعرا و مصنفین میں سے بعضوں کے حالات اور اُن کی تصاویر اگر میسر نہ آسکیں تو چنداں عجب نہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ عصرِ موجودہ کے بعض بزرگوں کو بھی اپنے حالات و تصاویر دینے میں تخلّف و تامّل ہوا

خدانخواستہ اس لئے نہیں کہ نامحرم نگاہیں اُن پر پڑیں گی بلکہ انکسار کی بےکیف فرسودگی اور "میں کس قابل ہوں" کی رسم کہن کا یہی تقاضا تھا حالانکہ اس سے کہیں بہتر عذر "عذر تساہل" ہے۔ جو "شانِ بے نیازی" کا بھی حامل ہے اور شایانِ ذہانت بھی۔ تاہم اس باب میں ہماری کوششیں جس قدر بارآور ہوسکی ہیں وہ نذرِ ناظرین ہیں۔

طباعت واشاعت

اب ان مجلدات کی طباعت واشاعت کا مسئلہ تھا جسمیں خوش آیند تصورات کے بجائے سرمایۂ مالی کی ضرورت تھی اس کے لئے ہم میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور کی فراخ حوصلگی کے رہینِ منت ہیں جنہوں نے ان مجلدات کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں لیکر اردو ادب کی ایک عظیم الشان خدمت کا تہیہ کیا ہے۔ ان مجلدات کی اشاعت پر اب تک اس فرم کا پچاس ہزار روپیہ صرف ہوچکا ہے۔ اِس کے علاوہ ڈیڑھ سو مجلدات اور تیار ہیں جو وقتاً فوقتاً استعدادِ حالات کے مطابق شائع کئے جائیں گے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اور کس قدر روپیہ صرف کرنا پڑیگا۔ یو۔پی میں منشی نولکشور آنجہانی کی وہ مساعی جمیلہ جو خدمتِ اردو کے متعلق ہیں اپنی آپ مثال ہیں لیکن میسرز عطر چند کپور کی فرم کا یہ تہیّہ بھی اپنے مقام پر جس قدر حوصلہ افزا و قابلِ ستائش ہے وہ بھی شاید اردو کی تاریخ میں فقید النظیر ثابت ہو۔ ان کا یہ کارنامہ یہ نہیں کہ تجارتی کاروبار

کے ضمن میں ایک عظیم الشان حوصلہ مندی ہے بلکہ وہ ایک اولوالعزمانہ ملکی خدمت ہے جسے درحصل جدیدۂ علم و ادب پر شہرتِ دوام کی مہر بن کر ثبت ہونا چاہیئے۔

اُرْدُو مرکز کا اسٹاف

ہم نے ذوقِ جستجو کو رہبر بنا کر ملک کے ان منتخب اہلِ قلم و انشاپردازوں کی خدمات حاصل کی ہیں جن پر اردو دنیا بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اِس گراں قدر ادبی جماعت نے جس انہماک و شغف سے اُردو مرکز کے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیا اُس کا اعتراف نہ کرنا حد درجہ کی ناانصافی ہوگی۔ درحقیقت اردو مرکز عبارت اسی جماعت سے ہے۔ اخباری دنیا سے تعلق رکھنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو ان حضرات کی قدر و منزلت سے واقف نہ ہو۔ ان کے اسمائے گرامی اس امر کی کافی شہادت ہیں کہ اُردو مرکز ملک کے بہترین انشاپردازوں کی ایک قابلِ فخر جماعت ہے۔

فہرست کارکنانِ اُردو مرکز

۱ ۔ حضرت اصغر مصنف نشاط روح

۲ ۔ سید عابد علی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ایڈیٹر ہزار داستان

۳ ۔ شیخ محمد ضیاءالدین شمسی جرنلسٹ

۴ - میاں تصدق حسین خالدؔ ایم - اے -

۵ - مسٹر منوہر سہائے انورؔ سہنسوانی جرنلسٹ -

۶ - پنڈت میلا رام وفاؔ ایڈیٹر سوراجیہ -

۷ - مولینا حامد علی خان صاحب بی - اے -

۸ - حضرت فاخرؔ ہریانوی بی - اے -

۹ - شیر علی خان صاحب سرخوشؔ مصنف تذکرہ اعجاز سخن -

۱۰ - شیخ عبد اللطیف صاحب تپشؔ بی - اے -

۱۱ - صغر حسین خان صاحب نظیرؔ لدھیانوی -

۱۲ - حضرت جگرؔ مراد آبادی -

۱۳ - مولینا گویاؔ جہان آبادی -

۱۴ - مولینا سیمابؔ اکبر آبادی ایڈیٹر پیمانہ -

۱۵ - شیخ محمد ہادی حسین قریشی ایم - اے -

۱۶ - سردار اودے سنگھ شائقؔ بی - اے - ایل - ایل - بی -

۱۷ - مسٹر یوسف سلیم بی - اے -

اُردو مرکز کی مجلس مشاورت

اُردو مرکز کے کاموں میں مسلسل طور پر مشورہ کی زحمت جن حضرات نے فرمائی ان کی التفاتِ بے پایاں کا اعتراف بھی ہم صدق دل سے کرتے ہیں - یہ محترم حضرات صرف یہی نہیں کہ اپنا وقت عزیز پابندی

کے ساتھ اُردو مرکز کے منتخبات پر ناقدانہ نظر ڈالنے پر صرف کرتے رہے۔ بلکہ معیار انتخاب قائم کرنے میں بھی انہوں نے اپنے زرّیں مشوروں سے مسلسل طور پر ہماری امداد فرمائی۔

ارا کینِ مجلسِ مشاورت

آنریبل سر شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا ممبر ایگزیکٹو کونسل پنجاب۔

خان بہادر شیخ نورالٰہی صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ انسپکٹر آف ٹریننگ انسٹیٹیوٹس صوبۂ پنجاب۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (ادبی نقاد)

آخر میں ہم اُس خدائے قادر و توانا کا شکر ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے نہانخانۂ غیب سے ہمارے لئے یہ اسباب و وسائل فراہم کر دیئے اور اپنے لطف و کرم سے ہمیں بُری بھلی خدمتِ زبان کی توفیق عطا فرمائی لیکن اُسی کی عادتِ جاریہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر اعلیٰ و صالح تحریک کے لئے مخالفین و مزاحمین کی بھی ایک جماعت تیار کر دیتا ہے ورنہ پھر نہ تو کسی پُر مغز و مخلصانہ خدمت کی قدر و قوت کا اندازہ ہو اور نہ اُسے پوری طرح پھیلنے اور کامیاب ہونے کا موقع مل سکے۔

ہندوستان میں جہاں تعمیر کے مقابلہ میں شوقِ تخریب اور بڑھانے کے عوض نیچے گھسیٹنے کا جذبہ نسبتہً زیادہ ہے ہم اِس سعادت سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ قبل اسکے کہ اُردو مرکز اپنی ناچیز خدمات

کا کوئی عملی ثبوت پبلک میں پیش کرے بعض حلقوں میں اس کے متعلق پیشتر ہی سے چہ میگویاں شروع ہوگئیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

ندانم تا چہ برقِ فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم
تصور کردہ ام بگسستنِ بندِ نقابش را

یہاں بھی اردو مرکز اور اس کے کارناموں کا "گسستنِ نقاب" تو ایک طرف محض اس کے تصور ہی سے ایک تلاطم اضطراب پیدا ہوگیا اور گھبرا گھبرا کر ہمارے دوستوں کی نگاہیں اپنے اپنے ترکشوں پر پڑنے لگیں۔ چنانچہ اردو مرکز اور اس کے اراکین کے متعلق پرائیویٹ صحبتوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کے صفحات میں بھی مختلف رنگ اور مختلف عنوانوں سے تنقیص و تعریض کا شریفانہ عمل شروع ہوگیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری طرف سے "اشتراکِ عمل" کی دعوت عام تھی بایں ہمہ بعض حلقوں میں اگر ایسی بیچینیاں موجود ہوں جن کی بنیاد میں ناگفتہ بہ جذبات کارفرما ہیں تو شاید ہماری اور اُن کی متفقہ کوششیں بھی اُسے زائل نہیں کرسکتیں۔ بہرحال ہمیں اور ہمارے دوستوں کو اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔ انجام کار کا فیصلہ اُسی خدا پر ہے جس نے محسود کو حاسد پر۔ فراخ دلی کو تنگ نظری پر۔ تعمیر کو تخریب بیجا پر ہمیشہ فتح دی ہے اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ ہم لوگوں کے لئے اپنے اس لازوال قانون میں تبدیلی ہرگز نہ کرے گا۔

ہم اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں کہ جس خدا نے ہمارے لئے

اسباب و وسائل مہیا کر کے ہمیں تھوڑے سے کام کی توفیق عطا فرمائی ہے اُسی نے ہمیں وہ صبر و سکون بھی مرحمت فرمایا ہے۔ جو ہر کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے۔ ہم اپنی جانب سے کسی سے اُلجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور اپنے کرمفرماؤں کی تعریض و نکتہ چینی سے بھی (خواہ وہ کسی رنگ میں کیوں نہ ہو) صرف اپنی اصلاح و فلاح کا فائدہ اُٹھانا چاہیں گے اور بس ع

بادہ گر خام شود پختہ کند شیشۂ ما

تاجور چیف ایڈیٹر

اُردو مرکز لاہور

دیباچہ

اردو شاعری کا دفتر بے پایاں جس میں ہمارے شعرا کی بہتر سے بہتر صلاحتیں صرف ہوئی ہیں مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل ہے جنمیں سے صنفِ مراثی بھی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ باوجود ایک تنگ اور محدود موضوع کے پھر بھی مناظر قدرت۔ مواعظ اخلاق۔ رقت۔ جذبات شجاعت واولوالعزمی غرضیکہ مہماتِ شاعری کے کون اجزا ہیں۔ جو ہمیں موجود نہیں۔ اسلئے اگر تاریخی حیثیت سے اُردو شاعری اور اُسکے بہترین نمونوں کو یکجا کیا جائے۔ تو یقیناً ہم اس صنف سے کسی طرح بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

انتخاب بجائے خود نہایت اہم کام ہے۔ ابو تمام کے مرتبۂ شاعری سے کِس کو انکار ہے۔ مگر اُس کی اصلی خدمت اُس کی شاعری نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ اس کا وہ انتخاب جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے۔ قطع نظر اس سے کہ خس و خاشاک کے ایک بڑے انبار سے گراں بہا جواہر ریزوں کو چُن چُن کر نکالنا اور پھر اُنمیں باہم ربط و تسلسل کا قائم رکھنا صحتِ مذاق و دیدہ ریزی کی ایک سخت آزمائش ہے۔ سب سے زیادہ دقّت یہ ہے کہ یہ تودۂ خاک مذہب و عقیدت کی زیارت گاہ بھی ہے۔ اسے کریدنا اور اِس طرح کریدنا کہ جذباتِ مذہبی کو ٹھیس نہ لگے۔ آسان نہیں۔ بہرصورت اِن تمام امور کو ملحوظ رکھ کر ہم نے انتخاب کیلئے جو اصول مدنظر رکھے ہیں۔ ان کو یہاں کسی قدر وضاحت سے بتا دینا چاہتے ہیں ؎

(۱) یہ انتخاب خالص ادبی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے اور غایتِ اصلی اُن حصص کی فراہمی ہے جنمیں کوئی مخصوص شاعرانہ خوبی (اپنے حقیقی معنوں میں) موجود ہو۔ اس لئے ایسی دور از کار

بیجا کاوشیں جن میں نہ جوش ہے نہ اصلیت اور نہ طرزِ بیاں کی کوئی خاص خوبی قطعاً نظر انداز کردی گئیں ۔

(۲) بند کا کوئی جزو حتیٰ کہ ایک مصرعہ بھی اگر شاعرانہ حیثیت سے اچھا نظر آیا۔ تو اُسے بھی کسی نہ کسی طرح اس مجموعہ میں لے لینے کی کوشش کی گئی ہے ۔

(۳) ایسی چیزوں کو بالکلیہ چھوڑ دیا گیا جن سے کسی کے جذبہ مذہبی کو صدمہ پہنچنے کا امکان تھا۔

(۴) بین و بکا کے سلسلہ میں ایسے مضامین جن سے طبیعتوں میں پستی و دنائت پیدا ہو۔ اُن کو بھی نظر انداز کردیا گیا ہے۔

(۵) حد سے گذری ہوئی باتیں یا وہ غیر معتدل و بیجا مبالغہ جنکی تاویل کسی شاعرانہ اسلوب بیان سے بھی نہ ہو سکی ان سب کو حذف کردیا گیا۔ ممکن ہے وہ باتیں خوارقِ عادات یا اسرارِ دینیہ کی رو سے معقول و مناسب ہوں۔ مگر چونکہ اس مجموعہ کی غایت صرف ادب شاعری کی خدمت ہے اور غرض یہ ہے کہ عام اربابِ ذوق بلا تفریقِ مذہب و ملت اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس لئے اس قسم کے "باب المناقب" "باب الخوارق" یا "باب المناظرہ" کے لئے گنجائش نہیں نکالی جاسکی۔

(۶) دورانِ مطالعہ و انتخاب میں یہ بھی محسوس ہوا کہ (غالباً سوز خوانوں کی بدولت) اکثر مراثی تحریف و تصرف سے بھی محفوظ نہیں۔ کہیں کا چہرہ کسی کا سراپا۔ کہیں کا رجز کسی کا بین یہ سب اس طرح باہم خلط ملط ہیں۔ کہ ان کا صحیح صحیح پتہ چلنا قریباً ناممکن ہے انتہا یہ کہ بند اور ابیات تک کہیں کے کہیں پہنچ گئے ہیں۔ اسلئے اگر کہیں کی بیت کمزور معلوم ہوئی تو بجائے اسکے دوسری بیت اسی مرثیے سے منتخب کرکے لگا دی گئی۔ مصرعے جو سہو کاتب سے غلط یا کمزور نظر آئے اُن کی اپنے طور پر تصحیح کردی گئی۔ مرثیوں میں تحریف و تصرف کا ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ مولینا سید علی حیدر طباطبائی لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی

نے مراثی انیس کی ترتیب میں اس کا بہت صاف صاف اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مرثیہ خوانوں کا ایک بڑا فرقہ پیدا ہو گیا کہ ان بزرگوں کا کلام جا بجا مجلسوں میں شہر شہر پڑھتے پھرتے تھے۔ بہت لوگوں کا ذریعہ معاش یہی ہو گیا تھا۔ مشکل انہیں یہ پیش آتی تھی کہ کسی امیر کی مجلس میں بہت سے ذاکر پڑھنے والے ہیں۔ ان کو بھی پندرہ بیس بند پڑھنے کی اجازت ہے۔ اب یہ مرثیے میں تصرف کرنے پر آمادہ ہیں۔ چاہتے ہیں ہیں ہی بند میں مطلع بھی ہو رخصت بھی ہو۔ رزم بھی۔ شہادت بھی۔ اس کی صورت یہ ہے۔ کہ اگر کچھ موزون کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں تو خود ہی بند انتخاب کر لئے۔ ربط کے لئے مصرعے بدل بدل دئے۔ اِدھر کی بیت اُدھر لگا دی۔ ایک مرثیے کے بند دوسرے مرثیہ میں لگا دئے۔ بحر بدل گئی تو انہیں خبر نہ ہوئی۔ خود ایسا نہ کر سکے تو کسی دوسرے سے مشورہ کر کے مرثیہ میں اس طرح کے تصرف کئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ یہ کام بعض احباب کی خاطر سے میں نے خود کیا ہے اور ایک دفعہ نہیں بہت دفعہ ایسا ہوا ہے۔ مدتوں بڑے بڑے مرثیوں میں سے چھوٹے چھوٹے مرثیے اس ترکیب سے نکلتے تھے اور مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ سوز خواں انہیں مرثیوں کی نقلیں لیکر انپر سوز رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کا کلام شاہنامہ کی طرح غیر کے تصرف سے پاک نہیں رہا۔"

(۷) انتخاب کے کاموں میں ہمیں حضرت اصغر۔ مرزا یاس یگانہ حضرت جگر مراد آبادی حضرت فاخر ہریانوی بی اے۔ میاں تصدق حسین خالد ایم اے۔ اور حضرت سیماب اکبر آبادی ایڈیٹر پیمانہ۔ شیر علیخاں صاحب سرخوش مصنف اعجاز سخن سے امداد ملی ہے۔ جس کے ہم تہ دل سے سپاس گذار ہیں۔ آنریبل خان بہادر سر شیخ عبد القادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا ممبر ایگزیکٹو کونسل خان

بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اپنے وقت عزیز کا گرانمایہ حصہ ہمارے انتخابات دیکھنے اور انتخابات کے متعلق مفید مشوروں سے مسلسل طور پر قابل قدر امداد فرماتے رہے ہیں۔ کارکن حضرات کے زاویہ نگاہ میں موافقت و یکسانیت کی حتی المقدور پوری کوشش کیگئی ہے۔ تاہم ممکن ہے کہ کہیں انتخاب و انتقاد کا معیار مختلف نظر آئے اس لئے قدرت نے طبائع میں جو فرق و امتیاز قائم کر رکھا ہے اُسے بالکل دور نہیں کیا جاسکتا۔ آیندہ ایڈیشن میں انشاءاللہ اس سے زائد ہمواری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۸) اس سلسلہ میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا ہے۔ کہ جہاں یہ انتخاب ادب و شاعری کے لحاظ سے ارباب ذوق کے طبقہ عالیہ میں شرف قبولیت حاصل کرے وہیں یہ بھی ہو کہ طلبہ اور عام تشنگان شعر و ادب بھی اس سے پورے طور پر مستفید ہو سکیں۔ اس لئے جا بجا فٹ نوٹ دیدئے گئے ہیں تاکہ یہ مجموعہ تعلیمی ضروریات کے لیئے بھی مفید و کارآمد ثابت ہو۔

مراثی کی فراہمی۔ مرثیہ گو شعرا کے حالات و تصاویر کے متعلق ہمارا مطمح نظر جسقدر بلند تھا اُسکے لحاظ سے ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ لکھنو میں ان چیزوں کو یوں تو نخاس کے کباڑیوں کے یہاں کوئی پوچھتا نہیں۔ مگر جب کسی کو خدمتِ علمی کے سلسلے میں اسکی تلاش ہو۔ تو پھر یہی چیز بقائے زندگی کا ایک ذریعہ سمجھہ لیجاتی ہے۔ اور اسے دوسروں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے سخت خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہمیں اس معاملہ میں جو پریشانیاں اٹھانی پڑی ہیں۔ اُن کا تقاضا تو یہی تھا کہ اس سے تلخ تر الفاظ میں ہم گلہ مند ہوتے۔ مگر کیا کیجئے کہ شکوہ سنجیوں کی بہ نسبت سپاس گزاریوں میں ہم زیادہ راحت پاتے ہیں۔ اسلئے خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کی ان عنایات پر جو انہوں نے شعرا کے حالات و مراثی کی فراہمی میں فرمائی ہیں۔ منت گذاری کا اظہار کرتے ہیں۔

تاجور

(۲۱ تا ۲۴ کریمی پریس لاہور میں طبع ہوا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۂ پیامِ زندگی

جذبۂ مسرّت

غم و مسرّت کے اسرارِ مخفیہ نے مُدّت سے اس باب میں دو مختلف نظریے پیدا کر رکھے ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کو دُوسرے پر آسانی سے ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ ایک فریق کہتا ہے کہ عالم اور اس کی تمام ہنگامہ زائیوں کا اصل مقصد سکون و طمانیت ہے۔ جس کا احساس تبسمِ نشاط سے گذر کر قہقۂ مسرّت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس لئے اِنسان اگر مصالحِ ہستی کا ماہر اور نظامِ فطرت کا رمز شناس ہے۔ تو اُس کی ہر حرکت و سکون کا مقصد مسرّت و شادمانی اور صرف مسرّت و شادمانی ہونا چاہیئے۔ اس کے نزدیک ہر ایسا منظر اور ہر ایسا واقعہ جو طبیعت میں انقباض و الم پیدا کرے قطعی نظرانداز کردینے کے قابل ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اِن چیزوں سے ہمارے نشاط انگیز دل و دماغ کو ایسی ہی کلفت و اذیت ہوتی ہے جیسی کسی مکروہ اور گھناؤنی شے کے نظّارے سے اور جب ہم اپنے جسمانی عیش و راحت کے لئے سختی و خشونت سے۔ مکروہ مناظر و کریہہ اصوات سے۔ تلخ اور بدبُودار اشیاء سے فطرۃً دُور دُور رہنا چاہتے ہیں۔

تو اسی طرح وہ تمام الم انگیز امور بھی قابل اجتناب ہوں گے۔ جن سے ہمارے ذہنی سکون اور قلبی مسرت میں خلل اندازیوں کا امکان ہو۔ جذبۂ غم۔ عیش وراحت کا یہی وہ فلسفہ ہے۔ جس پر اپٹیمسٹ گروہ (مسرورین) کے معتقدات وخیالات کی بنیادیں پڑتی ہیں۔ اور پھر اسی بنیاد پر ایپکیورین (نشاطئین) کے نظریہ کی شاندار عمارتیں قائم ہوتی ہیں۔ اور ذہنیات کی اکثر فضا "ایبٹ ڈرنک اینڈ بی میری" کے نعرہ ہائے انبساط ومستی سے گونج جاتی ہے +

جذبۂ غم دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ انبساط مسرت ولذت کا دھوکا ہے۔ انسان کی ابتدا غم ہے اور اس کی انتہا بھی غم۔ اس کا زمانہ حیات سخت سے سخت واقعات وحادثات کا اعادہ ہے۔ ہر چیز مائل بہ فناء اور ہر شے روبہ انحطاط ہے۔ مہاتما بدھ نے مطلقاً زندگی ہی کو "دکھ" بتلایا۔ اس لئے انسان اور بالغ نظر انسان کے نزدیک اصل شئے غم والم ہے۔ اور اس خاکدان عنصری کا ذرّہ ذرّہ درد وبیکسی کی ایک مجسم تصویر +

لیکن اصلیت یہ ہے کہ جب ایک مکمل اور جامع حقیقت کو دو حصّوں میں منقسم کرکے ان کو باہم حریفانہ طور سے ٹکرایا جاتا ہے تو ہمیشہ اسی قسم کے اختلافی مسائل افراط وتفریط کی شکلوں میں رونما ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ وہ ایک حقیقت صحیحہ کے اجزا ہوتے ہیں۔ اس لئے نہ وہ بالکلیہ مٹتے ہیں۔ اور نہ ایک کو دوسرے پر حقیقی معنوں میں غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ یہ اجزا بجائے خود مکمل نہیں ہوتے۔ اس لئے عمومی طور پر وہ ہر جگہ صحیح نہیں اترتے سا اور اس طرح فرداً فرداً دونوں اصول غلط نظر آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ رنج والم انسانی نفس کا وہ اخذ واکتساب

ہے۔ جس کے نتائج انبساط و مسرت کی شکلوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ انفرادی زندگی سے لیکر اجتماعی زندگی کی ہر آسودگی و کامیابی پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب نتیجہ ہے "کوفت، سوختت، اور اذیت" کا۔ وہ اشخاص یا وہ اقوام جنھوں نے مسرت و شادمانی ہی کو اپنا مقصود سمجھا۔ اور مصائب و آلام سے دُور دُور بھاگتے رہے۔ تم اُن کے بیشتر حصّے کو لذاتِ نفس میں مبتلا پاؤگے۔ اُن کے اخلاق و روحانیت کا اصلی جمال زائل ہوچکا ہوگا۔ اور اُن کی تمام بلند و شریفانہ صلاحیتیں مُردہ ہونگی۔ قومیں جب مُبتلائے تعیش ہوکر جمُود و غفلت سے بیکار ہوجاتی ہیں۔ اور اُن کی وہ رُوح و حرارت جو رزمگاہِ حیات کے لئے لازمی ہے مضمحل و افسردہ ہوجاتی ہے تو آلام و مصائب ہی ہیں جو اُن کے جمود کو حرکت اور غفلت کو بیداری سے بدل دیتے ہیں۔ اور پھر یہ سوز و گداز ہی ہے جو اُن کے نفسوں کو پگھلا پگھلا کر اخلاق و انسانیت کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ ایثار و محبت۔ سرفروشی و جانبازی۔ ہمدردی و صلہ رحمی اور اس طرح کی بہتر سے بہتر صلاحیتیں سب غم و الم ہی کے باعث بیدا ہوتی رہی ہیں۔ اور یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جو بر روئے کار آکر اخلاقی مسرت و روحانی شادمانی کا موجب ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے دُنیا کی ایک مقدس کتاب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ "ہنسو کم اور روؤ زیادہ"۔ یعنی یہ کہ تمہارے خرچ سے تمہاری آمدنی زیادہ ہونی چاہیئے۔

لٹریچر اور شاعری قوموں کے اخلاق و جذبات کا آئینہ ہے۔ ہماری کامیابی و فیروزمندی نے جہاں ہمارے انبساط و مسرت کو اس پر منعکس کیا ہے۔ وہیں ہمارے سوز و الم کی تصویر بھی اسی آئینہ میں نظر آتی ہے۔ درد و الم کے اسباب مختلف ہیں۔ مگر اس کا وہ مخصوص مظاہرہ جس کا تعلق کسی موت سے ہو۔

مرثیہ کے نام سے موسوم ہے +

موت ایک تو یُونہی عبرت وبصیرت کے لئے کم نہیں۔ لیکن اگر مرنے والے میں کوئی خاص شانِ امتیاز ہو۔ اور اُس سے ہمارا کوئی خاص تعلق بھی ہو۔ پھر تو واقعہ کے تاثیر کی کوئی انتہا نہیں رہجاتی۔ لیکن جس طرح قہقہہ بے ہنگام اکثر اوقات بے معنی وسطحی ہوتا ہے اسی طرح بے معنی گریہ وزاری بھی کوئی قابل اعتنا درجہ نہیں رکھتی۔ گریہ وزاری کی تہ میں جس قسم کا پست یا بلند جذبہ کارفرما ہو۔ اسی درجہ کا وہ رونا بھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ذرا ذراسی بات پہ بلکنے لگتے ہیں۔ اکثر نافہم اور فسادی عورتیں بلاوجہ ٹسوے بہانے لگتی ہیں۔ کہیں کہیں کرائے پر "میر بکائی" بلا لئے جاتے ہیں۔ اور فغان وماتم سے محفل کی محفل کو تہ وبالا کردیتے ہیں۔ اس لئے مرثیے کے اغراض پر ایک نظر ضروری ہے تاکہ یہ اندازہ کیا جاسکے۔ کہ ایک بلند نظر انسان اس میں کس حد تک حِصّہ لے سکتا ہے۔ اور ایک سنجیدہ دل ودماغ کی شرکت وشمولیت کی کیا شکل ہوسکتی ہے (غور کرنے سے مرثیے کے اغراض حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں :۔

(۱)۔ **طبیعی اثرات** :۔ (الف) مرنے والا ہمارا عزیز ہوتا ہے یا دوست یا معمولی شناسا۔ اس لئے غم بھی اسی تناسب سے ہوتا ہے +

(ب) فرض کیجئے۔ کہ مرنے والے سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں۔ مگر اس پر شدائد ومصائب زیادہ پڑے۔ جسے انسانیت کا عام جذبہ ہمدردی نہیں برداشت کرسکتا یا تعلق بھی ہے اور مظالم بھی شدید ہوئے۔ تو اسی تناسب سے غم والم بھی

زیادہ ہوگا +

یہ جتنی صورتیں ہیں وہ سب کی سب طبیعی اثرات کے ذیل میں آتی ہیں۔ "زمان و مکان" کا قرب و بعد ان اثرات کو قوی و مضمحل بناتا رہتا ہے۔ لیکن شاعر کے جذبات بنسبتہً زیادہ رقیق و سریع الاشتعال ہوتے ہیں۔ وہ ان واقعات سے متاثر ہوکر ان تاثرات کو نظم میں نمایاں کر دیتا ہے۔ مگر اس نظم کی کوئی خاص غرض و غایت نہیں ہوتی۔ یہ صرف اس کے غم و مذاقِ شعریت کا باہمی تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں شاعر خود اپنی دردمندی کو نمایاں کرتا ہے۔ اور واقعات و حالات کو اس کا لباس بناتا ہے +

(۲)۔ **اکتساب و اعتراف محاسن** ۔ مرنے والا اگر کسی خاص فن کا ماہر یا کسی خاص صفت سے متصف ہے۔ تو ہمارے شغف گریہ و زاری کی غرض نفسی اُن صفاتِ کمالیہ سے رابطہ و اکتساب کی ہوتی ہے۔ ہم ایسے مرنے والے کا ذکر مرثیہ یا یادگار وغیرہ کی صورت میں کرتے ہیں۔ تو در اصل ہم اُن صفات سے استواری تعلق کے ساتھ اُس کے احیاء و اشاعت کے بھی خواہش مند ہوتے ہیں۔ اسی شے کو عُرف عام میں ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) بھی کہتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص نپولین کا مرثیہ لکھے۔ تو اس کی غرض نفسی یہ ہے۔ کہ وہ نپولین کی شجاعت و الوالعزمی کا قدرشناس ہے۔ وہ مرثیہ لکھ کر نہ صرف اپنی شجاعت و الوالعزمی میں ازدیاد و اضافہ چاہتا ہے۔ بلکہ یہ بھی چاہتا ہے۔ کہ اپنی آواز سے تمام عالم کو اسی شجاعت و الوالعزمی سے لبریز کر دے۔ اس میں شاعر ایک کیرکٹر کو نمایاں کرتا ہے اور دردمندانہ واقعات کو اس کا لباس بناتا ہے +

(۳) **منافرت و اشاعت منافرت**۔ کسی شخص یا جماعت کے قوت و اقتدار کو جب نقصان پہنچانا مقصود ہو تو اس کی تحقیر و اہانت کے لئے سب سے پہلے اس کے خلاف جذبۂ منافرت کو برانگیختہ کیا کرتے ہیں۔ اور اس کے خلاف اگر کوئی واقعہ ہو تو اسے ضرورت سے زیادہ آب و رنگ دے کر چمکایا جاتا ہے اس کے ظلم و ستم کی داستان کو نمایاں کرنے کے لئے مظلوم کے کمالات و نیک نفسی کو ابھار ابھار کر دکھاتے ہیں۔ اور اس کی مظلومانہ حالت کا نقشہ اہانت انگیز حد تک کھینچا جاتا ہے۔ اس سے غرض نہ مظلوم کے کمالات کی اشاعت ہوتی ہے اور نہ ان کے مظلومانہ صبر و استقلال وغیرہ کی کوئی مثال قائم کرنا بلکہ صرف کچھ اشخاص یا جماعت کے خلاف منافرت پھیلانا اصل مقصود ہوتا ہے۔ ایک دامن کی صفائی اور اس کی سفیدی کا بار بار اس لئے ذکر کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس پر جو سیاہ دھبہ دکھانا ہے وہ اچھی طرح اجاگر ہو سکے۔ یورپ کے ایک مصوّر نے ایک برہنہ تصویر اس صنعت کے ساتھ طیّار کی۔ کہ دیکھنے والوں کی توجہ اس کی عریانی و برہنگی کی جانب کسی طرح مائل نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب پھر اس نے تصویر کی برہنگی کو نمایاں کرنا چاہا۔ تو تصویر کے پاؤں میں موزہ پہنا کر دکھا دیا۔ اور اس طرح دیکھنے والے کی نظروں میں تصویر کی برہنگی بالکل نمایاں ہو گئی۔ انسانی صنعت کی اس فریب کاری کا ذکر اگر کسی اور زمانہ میں کیا جاتا۔ تو شاید مشکل سے لوگ اس کی حقیقت کو سمجھ سکتے۔ مگر بیسویں صدی کے اس پیچیدہ دَور سیاسی میں ہر شخص اس صنعت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ یورپ کے ماہرینِ سیاست کی دردمندانہ تحریریں جنگ عظیم کے موقعے پر اخلاق و انسانیت کا ماتم۔ ہندوستان میں بعض سیاسی تحریکوں کے ساتھ جوشِ مذہب

کی ملکوتیت اس حقیقت کے سمجھنے کی کافی مثالیں ہیں۔ یہ صنعت آجکل تحریر و خطابت میں بھی عام ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے علمی مضامین اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی و مذہبی مواعظ کی تہ میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ مخالفت و منافرت کے تیز نشتر دبا کر رکھے جاتے ہیں۔ اور نظم و نثر کی کوئی ایسی صنف نہیں جس میں اس خطرناک فن سے کام نہ لیا جاتا ہو۔ لیکن چونکہ اس کا ظاہر کمال صنعت سے بے ضرر محفوظ بنایا جاتا ہے۔ اور اس کی شکل "اکتساب و اعتراف محاسن" سے بہت ہی مماثل و مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی گرفت آسان نہیں۔ لیکن اس کا مجمل و مختصر طریق سراغ یہ ہے۔ کہ یہ دیکھا جائے۔ کہ بہ حیثیت مجموعی اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ لکھنے والے اور اس سے لطف اندوز ہونے والے سے طرز زندگی سے اکتساب محاسن کے آثار ملتے ہیں یا صرف تحقیر و منافرت کے۔ اس میں **شاعر صرف منافرت کی اشاعت کرتا ہے۔ اور کبر بجبڑا اور دردمندی کو اس کا لباس بناتا ہے"۔**

مرثیہ اور اس کے عناصر ترکیبی کربلا کا واقعۂ خونین ان ہر سہ صلاحیتوں کا تنہا عامل ہے۔ جگر گوشۂ رسول جس نے ابتلا و شدائد میں رشتۂ شریعت کو آخیر وقت تک ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جو تین تین دن تک تشنگی و گرسنگی کے عالم میں سخت سے سخت آلام و مصائب کو صبر سے برداشت کرتا رہا۔ جس نے اپنی آنکھوں کے آگے اپنے فرزند و اعزا کو خاک و خون میں لوٹتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر بھی راضی بہ رضائے الٰہی رہ کر جادۂ استقلال سے قدم نہیں ہٹایا۔ اور آخر یہ کہ جس نے ہزارہا خونچکاں زخموں کی زبان سے تسبیح و تحمید کی۔ جس نے تلواروں

کی محراب میں رضا و تسلیم کی نماز ادا کی۔ اور آخری سجدۂ تقرب میں کہ عجز و خستگی نے جمال ازلی کو بے نقاب کر دیا تھا جان دے دی ؎

این نقد جان را کہ بہ حافظ سپرد دوست
روزے رخش بہ بینم و تسلیم وے کنم

(۱)۔ کون ہے؟ جس کے پہلو میں ایک درد مند دل ہو۔ اور اس واقعہ جگر گداز پر اس کی آنکھیں اشکبار نہ ہو جائیں۔

(۲) کون کہہ سکتا ہے؟ کہ ایسے اسوۂ حسنہ کی تقلید اور ایسے اعلےٰ کیریکٹر کی اشاعت، قوموں کی روح حیات کے لئے تریاق کا اثر نہیں رکھتی۔

(۳) اسی کے ساتھ جن سفاک ہاتھوں سے ایسے مظالم ہوئے۔ اُن کی شقاوت و بے رحمی پر اظہار نفرت بھی بالکل قدرتی ہے) لیکن اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے زمانۂ حکومت میں جو فتنے رونما ہوئے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں میں ایک سنگین پولیٹیکل اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انہیں سیاسی نزاعات کے ضمن میں بعض حلقوں نے اس منافرت کو زیادہ پُر معنی بنا بنا کر اس کے رشتوں کو دُور دُور تک پھیلانا شروع کر دیا۔ اور اس کی اشاعت و ترقی میں ضرورت سے زیادہ حصّہ لیا جانے لگا۔ یہ منافرت گو ابتدا ابتدا میں سیاسی اغراض کے ماتحت تھی مگر بالآخر "مذہبیت" کے لباس میں نمودار ہو کر بحث و مناظرہ اتلافِ مال و جان قتل عورات و اطفال کی تمام مہیب لعنتوں میں نمایاں ہوتی رہی۔ اور اس طرح مسلمانوں کی اجتماعی قوتوں کا شیرازہ برابر بکھرتا رہا۔ ہمارے زمانہ میں جب ترک موالات کا مسئلہ زوروں پر تھا۔ اُس وقت اس حالت کے سمجھنے کی ایک

نہایت اچھی مثال ہمارے سامنے تھی۔ وہ یہ کہ بعض مطالباتِ ملکی کی معقولیت اور مہاتما گاندھی کی عظمت سے خود گورنمنٹ کے ارکان و اعضاء کو اختلاف نہ تھا۔ مگر ملک میں جہاں اس طرح کی سنجیدہ اور معقول صدائے احتجاج بلند تھی۔ وہیں ایسے لوگ بھی موجود تھے۔ جو صرف "مہاتما گاندھی جی کی جے" کہہ کر ہر قسم کی غارت گری و بدامنی کو روا رکھنا چاہتے تھے۔ جس طرح ان مختلف عناصر کے امتزاج سے ہر ایک قسم کا خلط مبحث پیدا ہو گیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح "انتقام حسینؑ" کا نام لے کر ایک مدت تک مسلمانوں میں جا و بے جا مناسب و غیر مناسب طور پر فسادات و خونریزی کا بازار گرم رہا۔ مرثیے کے مایۂ خمیر میں یہ جذبہ و ذہنیت بھی شامل ہے جسے جنگ و اختلاف کے نفسیاتی نتائج سمجھنا چاہئے۔ اِس اجمال کی تفصیل اسلام کے ابتدائی نصف صدی کے تاریخی واقعات میں مِل سکتی ہے۔ یہ واقعات تاریخ اسلام کے مشکل ترین ابواب ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث اُس مورخ کا کام ہے جو مستقل حیثیت سے اس موضوع پر قلم اٹھائے۔ ایک ادبی بحث کے سلسلہ میں جب لٹریچر کے اسباب تخلیق کا ذکر آجائے۔ تو تاریخی واقعات سے استشہاد و اشارہ بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرصورت ادبیات کے خوشگوار مقاصد اس سے زائد تلخ و خشک مباحث کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

فنون لطیفہ اور اسلام ایام جاہلیت میں اگرچہ عربوں کی رگ رگ میں شاعری رچی ہوئی تھی۔ اور وہ بات بات پر فی البدیہہ قصائد و مراثی پڑھ دیا کرتے تھے۔ مگر ظہورِ اسلام کے بعد ان کا یہ مذاق روز بروز مضمحل و افسردہ ہوتا گیا۔ اس لئے کہ اسلام سرتا پا ایک عمل ہے۔ اس نے ایسے تمام افکار و مشاغل کو جو اکثر قوائے عمل

کے لئے برباد کن ثابت ہوئے ہیں۔ اپنے جد و جہد سے عملی ہنگاموں میں گم کردیا
فنون لطیفہ کی اعلےٰ ترین غرض ایک موضوع جمیل کی تشکیل و تخلیق ہے۔ مگر ایک
مُسلم کی زندگی ع

اقبال دل گرمے نگاہِ پاک بینے جان بے تابے

کی سراپا مصداق تھی اور یہی وہ "موضوع جمیل" ہے جس کی تخلیق و مصوری کے لئے فن لطیفہ کا ہر ہر شعبہ تشنہ و بے قرار رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل کے ہوتے رنگ۔ شیڈ اور اس کے کاغذی نوک پلک کی بحث فضول و بے کیف ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ تم لفظ "شکر" کی تحریر میں شین کے نقطوں اور کاف کے مرکز کی درستی میں جس قدر چاہو موشگافیاں کرلو۔ لیکن خود شکر کے ذروں میں اس نقطے اور مرکز کی تلاش سعئ بے معنی سے زیادہ نہیں۔ ایسے زمانہ میں کہ فنون لطیفہ کی عظمت بعض طبائع پر سختی کے ساتھ مسلط ہے۔ ہماری یہ مختصر رائے ممکن ہے کہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ معلوم ہو۔ اُن کے سامنے یورپ و امریکہ کی مثالیں ہوں گی۔ مگر یورپ و امریکہ کے تہذیب و تمدن کو حقیقی آئیڈل سمجھنے کی سعادت ابھی ہمیں نصیب نہیں۔ ہم انہیں ہنوز منزل تحقیق کا گم کردہ راہ مسافر پاتے ہیں اور ان کی بعض ترقیوں کو "فیل پا" کا مرض سمجھتے ہیں۔ کہ دیکھنے میں وہ نشوونما و ترقی ہے۔ مگر دراصل وہ ایک مرض ہے جس میں تجربات اور تلخ تجربات کے اُلٹ پھیر سے اگر زمانے نے تعدیل و توازن پیدا کردیا۔ تو اُس وقت "حقیقی صحت" کا واقعی طور پر اندازہ ہو سکے گا۔ یہ ایک دلچسپ و نادر بحث تھی۔ مگر افسوس کہ اس کا یہ موقع نہیں۔ بہر صورت واقعہ کربلا پر جو اس زمانہ میں مرثیے

نہیں لکھے گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ عربوں میں مرثیہ گوئی کا مذاق کم ہوگیا تھا۔ ابتداء میں بھی ان کی مرثیہ گوئی فوری جذبہ کے ماتحت ہوتی تھی۔ انہوں نے رونے رولانے کو فن نہیں بنایا تھا۔ لیکن زمانۂ اسلام میں تو ان کی یہ احتیاط اور بڑھ گئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے اور کون سا واقعہ جان گداز ہوسکتا تھا مگر اس پر بھی صرف حضرت حسان ابن ثابت رضؓ۔ حضرت فاطمہ زہراؓ اور ابوسفیانؓ کے کچھ مراثی عام شہرت رکھتے ہیں لیکن اس شہرت کی ایک وجہ خود ان شخصیتوں کی خصوصیت و شہرت ہے۔ اور مرثیے کا باعث واقعہ کا قدرتی حادثہ ہونا ہے جس میں رنج و الم عبرت و بصیرت کے سوا کسی دوسرے جذبہ کی گنجائش ہی نہیں برخلاف اس کے واقعہ کربلا کی الم انگیزیوں میں جذبۂ انتقام کا عنصر غالب ہے۔ ایسے موقع پر اسلام کی عملی زندگی کا یہی تقاضا تھا۔ کہ وہ شاعرانہ بین و بکا کو چھوڑ کر مردانہ وار میدانِ عمل میں اُتر آئیں +

واقعہ کربلا پر عربی مرثیوں کا فقدان

کہا جاتا ہے کہ سلاطین بنی اُمیہ کے جبر و تشدد نے شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ اور اِس لئے اس دَور میں واقعہ کربلا پر مرثیے نہیں لکھے جاسکے اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بعض سلاطین بنی اُمیہ و مروانیہ کا ظلم و جور مسلمہ ہے۔ لیکن جب اُن کے مقابلہ میں علانیہ تلوار بلند کی جاسکتی تھی۔ تو چند اشعار کا نظم کر دینا کیا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اسی سلسلہ میں ہمیں ایسے فرمانروا بھی نظر آتے ہیں جنہیں اہلِ بیت سے خاص عقیدت و محبت بھی تھی۔ تاہم مراثی کا کوئی قابلِ ذکر ذخیرہ تیار نہ ہوسکا۔ اس لئے قرینے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اوّل

تو عربوں نے اس سلسلہ میں مرثیے کی جانب توجہ ہی نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ کربلا کے بانیاں ستم کے خلاف جو قدرتی و منصفانہ جوشِ انتقام پیدا ہوگیا تھا۔ اس میں عجمی عنصر کی شرکت نے ایک اشتعال انگیز شدّت پیدا کر دی تھی اور اس طرح سرے سے اسلام کا تمام شیرازۂ حکومت ہی درہم و برہم ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس لئے حکومت کے اُن افراد نے جنہوں نے خود اس واقعہ پر خون کے آنسو بہائے بعید نہیں کہ عام خونریزی و نقصِ امن کے خوف سے اشتعال انگیز فنون کے روک تھام کی کوشش بھی کی ہو۔ غرضیکہ اسباب کچھ ہوں۔ بہرصورت جہاں تک تاریخ ادب کی رسائی ہے۔ یہ یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ عربوں نے عام طور سے اس واقعہ پر مرثیہ نہیں لکھا +

مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ

فارسی شاعری میں مرثیہ کا آغاز۔ مُلّا حسین واعظ نے روضۃ الشہدا نامی ایک کتاب ۹۰۰ھ و ۹۱۰ھ ہجری کے درمیان لکھی۔ یہ واقعات کربلا پر ایک مجموعہ مضامین ہے۔ جسے شاہانِ صفویہ کے عہد میں خصوصاً شاہ طہماسپ اور شاہ عباس کے زمانہ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ جو لوگ اس کتاب کو ماہِ محرم میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ روضہ خوان کہلاتے تھے۔ بلکہ اب تک ایران میں روضہ خوانی، مرثیہ خوانی و سوز خوانی کی مرادف سمجھی جاتی ہے۔ مُلّا صاحب کے علاوہ بعض اور شعرا نے بھی کثرت سے مرثیے لکھے۔ چنانچہ ان میں سے چند مشہور شعرا کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مُلا محتشم کاشی۔ اُنھوں نے پہلے تو غزل و قصائد لکھنے میں کمال حاصل کیا۔ اور مدحیہ قصیدہ شاہ طہماسپ صفوی کی شان میں لکھ کر پیش کیا۔ لیکن شاہ طہماسپ پر مذہبیت کا غلبہ تھا۔ اُس نے کہا کہ شعراء قصائد میں جو ممدوح کی تعریف میں بے جا مبالغہ صرف کرتے ہیں۔ اُنہیں چاہیئے کہ آئمہ اہل بیت کی شان میں کچھ لکھیں جہاں مبالغے کا بالکل احتمال نہیں ہو سکتا۔ مُلا محتشم کی یہ شاعرانہ کاوشیں جب بیکار ہو گئیں۔ اور انہیں دربار سے قصیدہ کا کچھ صلہ نہیں ملا۔ تو پھر مجبوراً ع

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کے مصداق آپ نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی۔ اور وہ معرکتہ الآرا نظم لکھی۔ جو کہ ہفت بند کاشی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بیشتر اشعار نہایت پُر تاثیر ہیں۔ متفرق مقامات سے چند اشعار یہاں نمونتہً درج کئے جاتے ہیں ؎

کشتی شکست خوردۂ طوفان کربلا — درخاک و خوں فتادہ بہ میدان کربلا

نگرفت دست دہر گلابی بغیر اشک — زاں گل کہ شد شگفتہ بہ بستان کربلا

در آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں — خوش داشتند حرمت مہمانِ کربلا

آں دم فلک بر آتش غیرت سپند شد

کز خوف خصم در حرم افغاں بلند شد

کاش آں زماں سرادقِ گردوں نگوں شدے — ایں خرقۂ بلند ستون بے ستوں شدے

کاش آں زماں کہ کشتی آل عبا شکست | عالم تمام غرقہ دریائے خوں شدے
کاش آں زماں در آمدے از کوہ تا بکوہ | سیل سیہ کہ روئے زمیں نیلگوں شدے
کاش آں زماں کہ پیکر او شد زدن خاک | جاں جہانیاں ہمہ از تن بروں شدے
کاش آں زماں کہ ایں حرکت کرد آسماں | سیماب وار روئے زمیں بے سکوں شدے
ایں انتقام گر نہ فتادے بروز حشر | با ایں عمل معاملۂ دہر چوں شدے

آل نبی چو دست تظلم بر آورند
ارکان عرش را بہ تزلزل در آورند

چوں خون خلق تشنہ او بر زمیں رسید | جوش از زمیں بذروۂ عرش بریں رسید
نزدیک شد کہ خانۂ ایماں شود خراب | از بس شکستہا کہ بارکان دیں رسید
باد آں غبار چوں بمزار نبی رساند | گرد از مدینہ بر فلک ہفتمیں رسید
نخل بلند او چو خساں بر زمیں زدند | طوفاں بآسمان ز غبار زمیں رسید
یکبار جامہ در خم گردوں بنیل زد | چوں ایں خبر بہ عیسیٰ گردوں نشیں رسید
پر شد ز شور غلغلہ چوں نوبت خموش | از انبیا بحضرت روح الامیں رسید
کرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار | تا دامن جلال جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
او در دلست ہیچ دلے نیست بے ملال

ظہوری۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کے یہاں بڑا رسوخ

حاصل کیا۔ اس کے مرثیے نہایت اعلیٰ پایہ کے ہیں ۔ مگر سوز و درد کے لحاظ سے محتشم کاشی کے ہفت بند کو نہیں پہنچتے ۔ چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

بیا کہ چہرہ تحوں جگر خضاب کنیم — جگر بہ آتش بیچارگی کباب کنیم
ہزار زخم برائے جگر بچشم کشیم — ہزار داغ برائے دل انتخاب کنیم
بیا ز گریہ لب خندہ را بہم دوزیم — ز اشک غم نمک آبی بہ چشم خواب کنیم
جحیم را شررے از تف جگر داریم — محیط را نے از دیدۂ پر آب کنیم
بساط خوشدلی اختلاط برچینیم — بہ کنج بیکسی از خویش اجتناب کنیم
ز سیل دیدہ تر دجلہ را آب دہیم — ز سوز برق جگر نیل را خضاب کنیم
گزید ماہی دل ساحل بلا وقت است — کہ غوطہ خواری گرداب اضطراب کنیم

بیا کہ دفتر غم پیش یاد بکشائیم
زبان پرسش زین العباد بکشائیم

مقبل:۔ اس نے مرثیے ہی کو اپنی شاعری کا تنہا موضوع قرار دیا۔ اور نہایت کثرت سے مرثیے لکھے ہیں۔ جن میں سادہ سادہ لیکن تفصیلی طور سے تمام واقعات کربلا کو نظم کر دیا۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے متعلق اس کے چند منتخب اشعار یہ ہیں : ؎

محرم آمد و گردید نوحہ سنجِ حسن — بلند کرد جہان نالہ را بصوت حسن
حوالہ گشت بہفت آسمان و ہفت میں — دو ہفتہ ماتم و دہ روز گریہ خونیں

زبسکہ داغ بہ تن سوخت است در پستان   زنسترن شدہ گلہا رباغ داغستان
روایت است کہ چون نورِ چشم پیغمبرؐ   رسید سوزشِ الماس ریزہ اش بجگر
فغان و نالہ خبر کرد محرمانش را   زخواب ناز بر آورد خواہرانش را
خصوص با دلِ غم دیدہ زینبِ مظلوم   بحجرۂ دگر آسودہ بود با کلثوم
شنید نالۂ بے تابی برادر را   ز اضطراب فراموش کرد بستر را
گرفتہ حضرتِ قاسم سرِ پدر بکنار   نشستہ زینب و کلثوم بر یمین و یسار
چوں ایں مشاہدہ فرمود سید الشہدا   خطاب کرد بہ زینب کہ اے فرشتہ لقا
ترا چہ شد کہ چنین دیدۂ تو گریان است   چہ واقعہ است چرا گیسوے پریشان ہست
جواب گفت چنیں نور دیدۂ زہرا   زتاب گریہ وزاری بہ سیّد الشہدا
کہ اے چراغ دو عالم زبرِ تو تُربش   چرا سوال نہ فرمودی از امام حسنؑ
چوں ایں شنید شہ تشنہ لب ز خواہرِ خویش
روانہ گشت سوئے مسند برادرِ خویش

مقبل کے بعد ایران میں مخلص۔ موزون۔ نسیم۔ شفیع۔ الفتی اور ملا محمد خاں نصیبی وغیرہ کے مرثیے مقبولِ عام ہوئے۔

اُردو مرثیہ گوئی (دکن میں)

عہدِ مغلیہ میں شعرائے ایران کی ہندوستان میں آمد شروع ہوئی۔ یہاں ان کی اس قدر عزت افزائی کی گئی۔ کہ اکثر ان میں سے یہیں رہ پڑے۔ یہ اسی قدر و منزلت کا اقتضا تھا۔ کہ علی قلی سلیم نے کہا ؎

نیست در ایران زمیں سامانِ تحصیل کمال　　تا سوئے ہندوستاں نامد حنا رنگیں نشد

یا مثلاً صائب نے کہا کہ ؎

ہمچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل ہست　　رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست

شعرائے ایران کی اس آؤ بھگت اور اس قدر افزائی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ فارسی لٹریچر اس ملک میں کثرت سے پھیلا۔ اسی سلسلہ میں مرثیہ گوئی کا مذاق بھی عام ہوا۔ چنانچہ سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ دکنی جو اکبر اور شاہ عباس صفوی کا ہمعصر تھا۔ مرثیہ خوانی اور ایام عاشورہ کی مجلسوں کا اتنا شائق ہو گیا۔ کہ ہر سال چوراسی پچاسی ہزار روپیہ اس تقریب میں صرف کرتا تھا۔ لیکن قطب شاہ دکنی پر کیا موقوف ہے۔ دکن کے اور تاجدار بھی عموماً شیعی مذہب تھے۔ جس سے دلی یا شمالی ہند کے بہ نسبت اُردو مرثیہ گوئی نے سب سے پہلے جنوبی ہندوستان میں نشو و نما حاصل کی ہے

سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ دکنی کے کلیات میں ایسے بہت سے اشعار موجود ہیں جنہیں مرثیہ سمجھا گیا ہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ دکنی اُردو میں سب سے پہلے اسی نے مرثیہ لکھا۔ اس کی ایک نظم کے چند اشعار نمونتہً درج ذیل ہیں:۔

؎

دو جگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن رُوں کی لکڑیاں جال کر کرتے ہیں خواری وائے وائے
آسمان جھج جالا ہوا سورج اگن والا ہوا
چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے

پھولاں تُسکے سب دکھ سنی مُکھ موندے بلبل جھکھ ستی
کوئل ہسی نہ دکھ ستی بن بن پکاری وائے وائے
دیکھو تمہیں اے مانساں دانے چریں نا پنکھیاں
دھرتی ہے ماتم کی دکھاں دھرتی بچاری وائے وائے
دو جگ خراباں ہو رہے حیواں کیا کیا ہو رہے
سُمندر سراباں ہو رہے نا ہوسئے جاری وائے وائے
یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر
کافر کیئے کیسے قہر سوز خم کاری وائے وائے
قُطبا کہے دل کے بچن۔ ہر دم مدد مجھ پنج تن
رکھے خدا مجھ کو جتن دشمن کو خواری وائے وائے
قُطبا کہ ہے اللہ مدد بستا ہے اس دل میں احد
تو جھ وحید رض ولد بیریاں کو زاری وائے وائے

ہاشم و کاظم۔ ولایت کی (غالباً ایڈنبرا یونیورسٹی کی ایک لائبریری میں ہاشم و کاظم کا کلام دو جلدوں میں محفوظ ہے۔ یہ دونوں جلدیں ۲۴۷۔ اوراق پر مشتمل ہیں۔ اور سنہ ۱۱۹۳ ہجری مطابق سنہ ۱۷۷۹ء میں نقل کی گئیں۔ اس میں جو اُردو نظمیں ہیں وہ ولی اور حاتم سے پہلے کی کہی جاتی ہیں۔ ہاشم نورالدین جہانگیر کے عہدِ حکومت میں برہان پور میں رہتا تھا۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۵ پر سُرخ روشنائی سے ایک تاریخ سنہ ۱۰۴۶ ہجری مطابق سنہ ۱۶۳۶ء کسی کرامت کے متعلق جو ہاشم کو محسوس

ہوتی تھی درج ہے۔ جس سے خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اس شاعر کے اردو میں طبع آزمائی کا یہی زمانہ تھا۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

ہاشم

کوئی زبیگانہ از بند و خطا ظلم تھا سب خویش و سب اقوام کا

ختم ہے یو امتحان و یو بلا ختم ہے جوں حق سیتی پیغام کا

زخم لاگا مصطفٰے کے سر اوپر گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا

زہر دے مارا حسن کو مکر سیں سبز تھا وہ چہرہ گلفام کا

کربلا میں تھے حسین ابن علیؑ آرزو میں شیر کے اک جام کا

ماتم آل نبیؐ ہاشم علیؑ آج کت ہیگا اسی ایّام کا

اسی کتاب کی دوسری جلد میں چند اور ابیات نہایت خوشخط حروف میں کاظم کی منظوم ہیں تخلص کے سوا اور معلومات اس شاعر کے متعلق درج نہیں۔ ابیات یہ ہیں ؎

کاظم

ہے نابکاراں دین کا چھتر گرانا کہاں روا

سرور نبیؐ کے لال کو یوں دکھ میں لیانا کہاں روا

رکھنا امام دین کے تئیں جنگل میں بے آب و ناں

طفلاں کو ان کے بے گنہ غم میں رلانا کہاں روا

خورشید برج دین کوں دنیا میں کیا شہید

روز قیامت میں سیہ روئی لے جانا کہاں روا
جن بٹھلاتے تھے نبیؐ دوشِ مبارک پر مدام
نیزے پر اُن کے سر کے تئیں رکھ کر پھرنا کہاں روا
وہ اصغرِ معصوم کوں سرورِ حسینؑ کے ہاتھ پر
پیکاں کے آب زہر سوں شربت پلانا کہاں روا

شاہان گولکنڈہ میں سے اکثر شاعر تھے۔ اُنہوں نے فارسی، آمیز دکنی زبان میں جسے چاہیئے تو دکنی اُردو کہیئے، دواوین مرتب کئے۔ اس عہد کے شعراء میں رام راؤ۔ سیوا دکنی۔ نصرتی۔ ہاشمی۔ غواصی۔ اور میرزان وغیرہ ہیں +

سیوا دکنی نے ۱۰۹۲ ہجری میں روضۃ الشہدا کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا پھر اس کتاب کو عِلم دکنی میں اپنی اُردو میں ترتیب دیا۔ نصرتی نے جو مرثیے لکھے ہیں وہ بھی اسی زبان میں ہیں۔ اس لئے زیادہ قابل توجہ نہیں۔ سنہ ۱۰۷۶ ہجری میں اُس نے علی عادل شاہ فرمانروائے دکن کی تعریف میں ایک کتاب "علی نامہ" اُردو نظم میں تصنیف کی۔ تو مندرجہ ذیل اشعار سے بہتر اشعار نہ نکال سکا ؎

رہے بیشہ لامکاں کا دلیر	علیؑ ولی او خدا کا ہے شیر
ولایت کا او رروکھ تھے سایہ دار	کہ ہر شاخ پر ہے نبوّت کا بار
محبّان کے دل میں ترا حُب یقیں	جنم جگ ہے ایماں کا حصن حصیں
تو اک کوٹ ہے بُرج جس کے تمام	او بارہ اماماں علیہ السّلام

ہوا جب سے اس کا حصار استوار زمیں پائداری سوں ہے برقرار

دہلی میں مرثیہ گوئی

ولی

دہلی میں مرثیہ گوئی کا مذاق کچھ تو دکن والوں اور کچھ ایرانیوں کے مخالطت باہمی سے پیدا ہوا۔ ولی نے دکنی زبان کو صاف کر کے طرز ریختہ کی بنا ڈالی۔ اور شیخ سعد اللہ گلشن دہلوی کی صحبت سے مستفید ہو کر اُردو شاعری کے قالب بیجان میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ انہوں نے ایک مثنوی شہدائے کربلا کے احوال میں لکھی ہے۔ خاتمۂ مثنوی پر لکھتے ہیں ؎

کیا ہوں ختم جب یہ درد کا حال گیارہ سو پہ تھا اُنیسواں سال
ولی اب رکھ قلم اور ختم کر بات نبیؐ اور آل او پر بول صلوات

فضلی

اسی زمانہ میں فضلی نے روضۃ الشہداء کا خلاصہ اُردو زبان میں مرتب کیا۔ اور اس کا نام "دہ مجلس" رکھا۔ حضرت قاسم کی شہادت پر ان کا ایک مرثیہ (یا نوحہ) مسلسل نظم کی صورت میں ہے۔ اس میں حضرت فاطمۃ الکبریٰ کے جذبات کی اس طرح ترجمانی کرتے ہیں ؎

تقدیر نے میرے نہیں گھونگٹ ہی میں افسوس
میرے بنے کی جھمی لالاش دکھائی
یہ کیا بُرا پیرا اٹھا میرا ہائے اے لوگو!

دولہا کو سوہائی نہ میں اور موت سوہائی

اے لوگو! میں ڈھونڈ پھری تھی کیا جو میرے آتے

دولھا موا۔ تھی یہ میرے قدم کی بُرائی

اے لوگو! میں بختوں کی جلی ایک ذرا بھی

صورت بنے اپنے کی نہیں دیکھنے پائی

اے لوگو! یہ ایک پل میں بسا گھر میرا اُجڑا

یہ کیسے پھری موت کی اب رائی دوہائی

لاشہ کے کنے بیٹھ کہا اے مرے نوشہ

تو مر گیا اور میرے تئیں موت نہ آئی

اے مرے بنے مجھ سی بنی بیٹھے تیرے پاس

تو نے یہ مجھے تج گورستی آنکھ لگائی

اے میرے بنے تیری بنی تیرے بنا ہائے

کفنی گلے میں ڈال کرے گی یہ گدائی

اے میرے بنے ساس کو کیا منہ میں دکھاؤں

دل میں کہے گی کیسی بہو بیاہ کے لائی

ولی کا زمانہ آخر سودا اور میر کا عنفوانِ شباب تھا۔ مگر ان کے عروج سے دِلی میں مرثیے کا اچھی طرح رواج ہو چکا تھا۔ سودا نے اپنے وقت کے مشہور مرثیہ گو میاں مسکین کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

دا سقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکیں کہاں ہے

میر

میر تقی میر نے بھی مرثیہ کہا ہے۔ ان کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

(۱)

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے　　مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے　　حسینؑ علیؑ کی شہادت کی شب ہے

(۲)

محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہے　　ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے　　کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے

(۳)

کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا　　وہ دل کیا ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا　　قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جو اب ہے

(۴)

ہے چاروں طرف ہو رہا شورِ محشر　　زمیں آسماں ہو رہا ہے تلے اوپر
حسین علی پر چلایا ہے خنجر　　ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

(۵)

بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے　　یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہِ تشنہ لب کا کسے غم سنائے　　یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے

سودا

مرزا سودا نے اس کا ردِ عمل تمہید میں فرماتے ہیں :-

لیکن مشکل ترین دقائق مرثیہ کا معلوم کیا - کہ مضمون واحد کو ہزار
"رنگ میں ربطِ معنی دیا - اس کام میں محتشم سا کسی نے عز و قبول
نہیں پایا پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیے کہے نہ کہ برائے
گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"

مرزا کا مفہوم "مرتبہ در نظر رکھ کر" معلوم نہیں کیا تھا - اس لئے کہ خود جو مرثیہ لکھا ہے - اس میں اس سے زیادہ کوئی ترقی نہیں کی ہے - ان کے ایک مشہور مرثیے کے پانچ بند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :- ؎

(۱)

یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے — انصاف سے جواب دو حیدرؓ کے واسطے
وہ بوسہ گہہ نبیؐ تھی پیمبر کے واسطے — یا ظالموں کی تُرشِ خنجر کے واسطے

(۲)

دیکھا جہاں میں کافر و دیندار کا بھی پیر — ان کی سی پر قساوت قلبی نہ کی میں سیر
پینے دیں آب انس سے لے تا بہ وحش طیر — مانع ہوں ابن ساقی کوثر کے واسطے

(۳)

اُمّت ہے وہ کہ خانۂ دیں کی ہو پاسباں — یا لوٹ لیوے اپنے پیمبر کا خانماں
آتش برائے بخت دیر آئی تھی درجہاں — یا دینے کو وہ فاطمہؓ کے گھر کے واسطے

(۴)

راوی لکھے ہے خورد وکلاں رن میں جب مُوا
نیزے سے اوپر نیزے سب کا لہو چُوا
شش ماہہ طفل اصغر معصوم تک ہوا
طُعمہ عقاب تیر ستمگر کے واسطے

(۵)

تنہا پھر اُس زمیں پہ رہا شاہ کربلا
اُس کا بھی تیغ ظلم سے آخر کٹا گلا
بعد اس ستم کے خیمہ ہوا مورد بلا
غارت گردوں کے ہاتھ سے زیور کے واسطے

سکندر پنجابی

اسی زمانہ میں خلیفہ محمد علی سکندر ایک مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔ یہ پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن تلاش معاش کے سلسلہ میں لکھنؤ میں بود وباش اختیار کر لی تھی۔ یہ اردو۔ پنجابی۔ پوربی اور مارواڑی زبانوں میں بھی مرثیے کہتے تھے۔ اور بہت مؤثر انداز میں پڑھا کرتے تھے۔ اُس وقت تک مرثیے عموماً چو مصرعے ہوا کرتے تھے۔ بیت لگانے کا شرف اولیت[۱] میاں سکندر کو حاصل

---

[۱] بعضوں کا خیال ہے کہ مرثیے میں مسدس کا شرف ایجاد بجائے سکندر کے حیدری کو حاصل ہے۔ اس کا ایک بند اور صرف یہی ایک بند عام طور پر مشہور ہے ؎

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے
شب رخصت ہے بہنوں سے شہ دین کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے
سرہانے بی بی سکینہ کے کھڑی دیتی دُہائی ہے
مُنہ اس کا چومتی ہے اور یہی کہہ کہہ کے روتی ہے
اری اُٹھ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

حیدری دکنی ہے اس کا سنہ پیدائش ۱۱۶۷ہجری بتلایا جاتا ہے۔ پہلے وہ دکن سے دلی آیا۔ بعد کو زمانہ شجاع الدولہ میں مرشد آباد پہنچا۔ اس نے ولی دکنی کی غزلوں پر غزلیں بھی لکھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرثیہ بھی خوب کہتا تھا۔ مولوی کریم الدین نے ڈاکٹر اسپرنگر کے کتب خانے میں اس کا کلیات دیکھا تھا۔[۲۶]

ہے یا مرزا سودا کو۔ اس کا فیصلہ دشوار ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے۔ کہ مسدس کی طرز کا مرثیہ جو لکھنؤ اور نواح میں بے حد مشہور ہوا۔ وہ سودا کا نہیں بلکہ میاں سکندر پنجابی کا ہے۔ اہلِ پنجاب کا یہ فخر بے جا نہیں کہ لکھنؤ کا موجودہ طرزِ مرثیہ گوئی اس لحاظ سے اُن کے ایک ہم وطن شاعر کا بڑی حد تک رہینِ منّت ہے۔ سکندر کے اس مشہور مرثیے کے چند ابتدائی بند یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

ہے روایت ستر اسوار کسی کا تھا رسول　　اُن دنوں شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول
جس محلہ میں بہم رہتے تھے حسنین و بتول　　ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیمار و ملول
خط لئے کہتی تھی پردہ کے قریں زار و نزار
اِدھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

ناگہاں سُن شتر اسوار وہ آوازِ حزیں　　باادب آن کے کہنے لگا پردہ کے قریں
کوئی اس گھر میں دلاسے کو ترے ہے کہ نہیں　　اتنی سی عمر میں کیا دُکھ ہے جو تو ہے غمگیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۲۵ - ایک مرثیہ دیکھا تھا۔ جس کا پہلا بند وہ ہے۔ جو اوپر نقل کیا گیا۔ حیدریؒ نے ۱۱۶۰ہ ہجری میں وفات پائی۔ اس دور میں اُردو زبان کا جو پایہ تھا۔ اس کے لحاظ سے مذکورہ بند کی زبان ایسی ہے کہ حیدری کو سکندر تو ایک طرف میر و مرزا بلکہ دبیؔ پر بھی فوقیت حاصل ہونی چاہئے۔ لہٰذا اس بند کے بارہ میں جو حیدریؒ سے منسوب ہے غالباً کچھ سہو ہوا ہے۔ ممکن ہے جس کا یہ بند ہے وہ میر سید محمد حیدر بخش حیدری ہو۔ جس نے اُردو نظم و نثر میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً طوطا کہانی۔ گلزار دانش ترجمہ بہار دانش۔ قصہ بہرام گل اندام وغیرہ۔ اسی حیدریؒ نے ۱۲۰۹ہ ہجری میں گل مغفرت کے نام سے واقعات کربلا پر بھی ایک کتاب لکھی۔ ممکن ہے کہ یہ مرثیہ بھی جسے مولوی کریم الدین نے ڈاکٹر اسپرنگر کے کتب خانے میں دیکھا تھا۔ اور جس کا ایک بند عام شہرت رکھتا ہے۔ اسی حیدری کا ہو۔ ہمارا یہ قیاس اگر صحیح ہو۔ تو اس صورت میں اسے مسدس کے طرز کا پہلا مرثیہ کہنا یقیناً غلط ہوگا + ۱۲

کون سی قوم کی لڑکی ہے تو بیمار و صغیر
کیا ترا نام ہے تو کس کے لئے ہے دلگیر
وہ لگی کہنے کہ سن بندۂ حی القیوم میرا نانا ہے نبیؐ بابا علیؓ باب علوم
یہ محلہ بنی ہاشم کا ہے سب کو معلوم اور میں لڑکی جو بیمار ہوں دکھیا مغموم
فاطمہؓ صغرا اسی واسطے ہے میرا نام
دادی زہراؓ کی سی صورت ہے مرے منہ کی تمام
ایک تو فاقہ کشی دوسرے میں ہوں بیمار ایک دانہ نہیں کیا دوں تجھے اے ناقہ سوار
ایک مقنعہ ہے مرے سر پہ سو دیتی ہوں اُتار میں نے بخشا مرے بھائی مرا خط لیکے سدھار
کہیو رو رو کے زبانی یہ میرا سب سے پیام
بندگی میرے بڑوں کو مرے چھوٹوں کو سلام
میرے ماں جائے سے کہیو کہ تو اتنا کیجو میری جانب سے سکینہ کی بلائیں لیجو
اور مری بہنوں سے رو رو کے یہی کہہ دیجو کھانا داں کھاؤ تو یاں آن کے پانی پیجو
بھائی اکبر سے یہ کہیو کہ وطن کو جاؤ
پھیر بابا کو مدینہ کی طرف لے آؤ

ان کے علاوہ دہلی میں اور متعدد مرثیہ گو شعرا مثل گدا۔ محزون۔ تنبوا۔ افسر اور وصال وغیرہ ہوئے جنہوں نے مستقل طور سے مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔

لکھنؤ میں مرثیہ گوئی

دہلی کی تباہی اور مسلمانوں کی عام فلاکت نے بڑے بڑے باکمالوں کو شاہانِ اودھ کی فیاضیوں کا اُمیدوار بنا کر لکھنؤ پہنچایا۔ سلطنت اودھ کا ابتدائی پایہ تخت فیض آباد تھا۔ اس لئے لکھنؤ کے اکثر باکمال شعرانے جو دہلی سے آئے تھے اوّل اوّل فیض آباد میں اقامت اختیار کی۔ جب اودھ کا پایہ تخت بجائے فیض آباد کے لکھنؤ ہوا۔ تو یہ شعرا بھی رفتہ رفتہ لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی بالکل ابتدائی حالت میں پہنچی تھی۔ مگر یہاں پہنچ کر اسے بڑی ترقی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اطمینان و فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ دولت کی بہتات تھی۔ بڑے بڑے باکمالوں کا مجمع تھا۔ سلطنت کا مذہب شیعہ تھا۔ آئے دن مجلسیں ہوتی تھیں۔ رؤساء و امراء کی طرف سے ایک ایک مجلس پر ہزارہا روپیوں سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ صرف مرثیہ گوئی کو ترقی ہوئی۔ بلکہ مشغلۂ نظم کی کثرت سے زبان نے اپنی مستقل حیثیت قائم کر لی۔ اور دہلی کی تقلید سے آزاد ہو گئی۔ جن شعرا نے خصوصیت کے ساتھ مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ ان میں میر خلیق۔ فصیح۔ دلگیر۔ ضمیر۔ دبیر۔ انیس وغیرہ ہیں +

میر خلیق

میر خلیق کے مرثیے اوّل تو دستیاب نہیں ہوتے۔ اور اگر ملتے ہیں۔ تو پھر وہی میر انیس یا میر اُنس کے مرثیوں میں بھی شامل نظر آتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اُنھوں نے اس فن میں کن کن چیزوں کا اضافہ کیا۔ لیکن چند

بند جو علامہ شبلی مرحوم نے موازنہ میں درج کئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر بہی مشابہت ہے۔ تو بقول علامہ موصوف "بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں"۔ وہ بند نمونتاً یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ میر خلیق کے ایک سلام کا مطلع و مقطع مشہور ہے ؂

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا　　دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا
گذری بہار عمر خلیق اب کہینگے سب　　باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

مرتا ہے باپ اے علی اکبر ابھی نہ جا　　دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا
اے لال! سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا　　ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا
مضطر ہوں چین آئے پر آتا نہیں مجھے
رونے میں مُنہ ترا نظر آتا نہیں مجھے

ماتھے کو چومتے تھے کبھی اور دہن کبھی　　تکتے تھے سوئے زلف شکن در شکن کبھی
رونے تھے لیکے بوسۂ سیب ذقن کبھی　　یوسف کا اپنے سونگھتے تھے پیرہن کبھی
ملتے تھے خشک ہونٹ لب گلعذار سے
سینہ پہ رکھتے تھے کبھی مُنہ اپنا پیار سے

فوجوں کا ہجوم

پیاسے پہ مثل ابر اُمنڈ آئے دل کے دل　　شعلے صفت چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
چلوں میں تیر رکھ کے بڑھے روم و رے کے بل　　تیغیں اپی ہوئی جو کھینچیں ہٹ گئی اجل
دن کو سیاہیِٔ شب ظلمات ہو گئی

کھوے نشان شامیوں نے رات ہوگئی

تلوار

موجیں زرہ حباب ہیں سراس کے سامنے شق ہیں بہادروں کے جگراس کے سامنے
رکھتی ہے کیا بساط سپراس کے سامنے تنکے ہیں جبرئیل کے پر اُس کے سامنے
ماریں کمر کا ہاتھ اگر پاؤں گاڑکے
دو ٹکڑے آسیا کی طرح ہوں پہاڑ کے

فوجوں کی بدحواسی

حیراں تھے کب حسام سے کاٹھی جُدا ہوئی ترکش میں ڈھونڈتے تھے کہ تلوار کیا ہوئی

میر ضمیر

غرضکہ کہا جاتا ہے۔ کہ میر خلیق نے اور اسی طرح میاں دلگیر نے تو صرف بینہ مضامین پر اکتفا کی۔ لیکن میر ضمیر یعنی مرزا دبیر کے اُستاد نے مرثیوں میں رزمیہ اور سراپا ایجاد کیا۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ غلط الفاظ جو مرثیوں میں اِستعمال کئے جاتے تھے ترک کئے۔ بندش میں صفائی اور چستی پیدا کی۔ اور اصلیت یہ ہے۔ کہ چند در چند خصوصیات کی بنا پر تاریخ مرثیہ گوئی میں ایک نئے دور کا آغاز انہیں کے دم سے ہوا۔ واقعات وروایات میں اضافہ اور مضامین میں اختراع و ایجاد سب انہیں کی جدت طرازیوں کی رہین منت ہے +

مرثیہ کے مہمات موضوع یہ ہیں۔ گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔ جذبات انسانی کی کیفیت قدرتی مناظر۔ واقعہ نگاری اور ہنگامۂ جنگ کا نقشہ جن پر نئے نئے اسلوب اور نئے نئے انداز سے اس کثرت کے ساتھ طبع آزمایاں کی گئیں

کہ مرثیہ گوئی کا دامن نہایت وسیع ہوگیا *

انیس و دبیر

میرانیس و مرزا دبیر نے استعارات و تشبیہات کی شگفتہ جدتوں سے میر ضمیر کے طرز میں اور لطافتیں پیدا کر دیں۔ بالخصوص قدرتی مناظر اور محاکات کے ایسے نادر نمونے تیار کر دئے۔ کہ آجکل باوجود نیچرل شاعری کے غلغلے کے ایسی مثالیں مشکل سے پیش کی جاسکتی ہیں *

میر نفیس مرزا اوج رشید و کامل وغیرہ

ان کے بعد میر نفیس۔ مرزا اوج۔ پیارے صاحب رشید۔ علی میاں کامل وغیرہ نے اپنی مشاقیوں کے کمالات دکھلائے۔ ان کے کلام میں رنگینی اور زور بیان زیادہ ہے۔ بڑے بڑے طولانی مرثیے شروع سے آخر تک "باغ و بہار" بنے ہوئے ہیں۔ بین و بکا بھی بکثرت ہے۔ مگر حقیقی سوز و درد خال خال نظر آتا ہے۔ مرزا اوج کے مرثیوں میں جدت فکر اور علمی اشارات بھی پائے جاتے ہیں مگر اس دور کی تمام شاعرانہ کاوشوں میں آورد و تصنع کا عنصر غالب ہے۔ ان تمام شعراء کا منتخب نمونہ کلام ان مجلدات میں اپنے اپنے موقع پر پیش کیا گیا ہے اور ان کے محاسن شاعری بھی عنوانات و تشریحی نوٹ کے ساتھ نمایاں کر دئے گئے ہیں۔ اس لئے غیر ضروری طوالت بیان سمجھ کر یہاں اس کا اعادہ بے کیف سا معلوم ہوا۔ اس لئے ترک کیا جاتا ہے *

لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ایک اجمالی نظر

میر خلیق و میر ضمیر وغیرہ کے ابتدائی دور سے متاخرین کے وقت تک

اگر لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔ تو مندرجہ ذیل امور صاف صاف نظر آئیں گے :۔

(۱)۔ متقدمین شعرائے لکھنؤ پر دلی کا رنگ شاعری غالب ہے۔ انتہا یہ کہ میر انیس کا کل حصّہ زندگی فیض آباد اور لکھنؤ میں بسر ہوُا۔ لیکن خاندان پر جو دلی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کا اثر ان کی شاعری میں بیّن طور پر نمایاں ہے۔ پرواز خیال تو ایک طرف زبان بھی دِلّی کی استعمال کر جاتے ہیں۔ "اٹھائیاں بہائیاں" بمعنی "اٹھائیں۔ بہائیں" دلّی کی قدیم زبان ہے۔ مگر میر صاحب بلا تکلف استعمال کر جاتے ہیں ؎

سب جانتے ہیں دست علی کی صفائیاں　　سرکیں نبیؐ کے سامنے کیا کیا لڑائیاں
عالم کے سرکشوں نے شکستیں "اُٹھائیاں"　　بدر و اُحد میں خون کی نہریں "بہائیاں"

مدح علی رسول خدا کی زباں پہ ہے
لاسیف ولافتی کی صدا آسماں پہ ہے

(۲)۔ لکھنؤ کی زبان نے جب اپنی مستقل حیثیت قائم کر لی۔ اُس وقت سے فن اور قوت نظم کے لحاظ سے یعنی جہاں تک کہ قواعد محاورات اور الفاظ کے دروبست کا تعلق ہے۔ شاعری میں پختگی تو پیدا ہوئی۔ لیکن تاثیر کے اعتبار سے مرثیہ گوئی بلکہ تمام اصناف شاعری کا مرتبہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ بندش الفاظ کی چستی۔ خیال آفرینی کی سعی زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن سطحیت۔ غیر معتدل۔ طرزِ تخیل اور دور از کار موشگافیوں سے آگے بات نہیں بڑھتی۔

(۳) لفظی رعائتیں اور بے جا صناعیاں جن کی فراوانی روح تاثیر کی حقیقی

دشمن ہے۔ بہت بڑھ گئیں ÷

(۴) مرثیت جس کی حقیقی غرض پُرسوز و شریفانہ جذبات کی برانگیختگی اور محاسن اخلاق کا درسِ بصیرت ہے بتدریج کم ہوتی گئی۔ اور بجائے اس کے ساقی نامے گل و بلبل اور حسن و عشق کی رنگینیاں دکھائی جانے لگیں ÷

(۵) "حسن و عشق" اور "گل و بلبل" کی ان رنگینیوں میں بھی زیادہ حصہ پستی و ابتذال کا ہے۔ ضلع جگت کی عمومیت تو ایک طرف مرثیے میں ایک نئی صنف ہرشے کا بھی اضافہ ہوا جس میں انتہائی بازاریت اور مغلظات و فحش گوئی تک کا رواج جائز سمجھ لیا گیا ÷

(۶) مرثیوں میں بجائے اس کے کہ جناب سید الشہدا کے پاکیزہ کیریکٹر یعنی آپ کے اولوالعزمانہ صبر و استقلال اور آپ کے رضاء و تسلیم کو ابھار ابھار کر دکھایا جاتا اور اس طرح آپ کے اعلیٰ صفات کے نشر و اشاعت پر اکتفا کی جاتی۔ اسی سلسلہ میں محض طنز و استہزا بلکہ کہیں کہیں علانیہ سب و شتم سے بھی کام لیا جانے لگا جس سے واقعہ اور شاعری دونوں کی روحانی عظمت کو نقصان پہنچنے لگا ÷

مذکورہ امور کے اسباب اور مرثیہ پر ایک عام تبصرہ

مرثیے کی ابتدا دولت صفویہ سے ہوئی۔ شاہانِ صفویہ کا مشہور کارنامہ بقول پروفیسر براؤن یہ ہے۔ کہ انہوں نے بہ جبر لوگوں کو شیعہ بنایا۔[1]

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد چہارم ÷

روحانیات و ذوقیات کی پامالی کی۔ اور صوفیا کو جن کے وجدانی جوش وخروش سے فارسی شاعری میں روحِ حیات دوڑ رہی تھی تہ تیغ کیا۔ ان کی خانقاہوں کو مسمار کر دیا۔ اور دو صدی سے زائد اپنے زمانۂ حکومت میں باوجود صدہا شعراء کی سرپرستی کے حقیقی معنوں میں ایک بھی اعلےٰ وجاندار شاعر جس میں جدّت و لطافت کی حقیقی روح ہو نہ پیدا کر سکے۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں صرف ستر برس کے طوفانی دَورِ تیموریہ میں حافظ شیراز کے علاوہ تقریباً آٹھ یا دس ایسے شاعر پیدا ہوئے جنہیں فارسی لٹریچر کسی طرح فراموش نہیں کر سکتا۔ پھر یہی حکومت صفویہ ہے۔ جس نے شعرائے ایران کے طبائع کی قدرتی رَو کو روک کر اُسے تنگنائے مراثی میں مقید کیا۔ اور شاعری میں مصنوعی جذبات کی نمائش کا اولین سنگ بنیاد قائم کیا۔ کچھ شعراء نے دربار مغلیہ میں آکر پناہ لی۔ کچھ وہ شعراء جو مرثیہ کا مذاق اپنے ساتھ لائے تھے۔ تاجدارانِ دکن کے یہاں پہنچے۔ دکن میں شیعی حکمرانوں نے اپنی زبان میں مرثیہ کو رائج کرنا چاہا۔ لیکن گولکنڈہ کی تباہی کے بعد دہلی میں تہذیب وتمدن کی ترقیوں نے ان شعراء کو دہلی پہنچایا +

سلاطین مغلیہ نے فارسی زبان اور فارسی لٹریچر کی بے حد قدر افزائی کی۔ شعراء کے افکار ذہنی کے لئے کوئی قید وبندش بھی نہ تھی۔ جو کچھ طبیعتوں کا حقیقی تقاضا ہوتا وہ باتیں نظم میں ادا کی جاتیں۔ خلوص جذبات اور اُس سے لفظ وبیان کا صحیح ربطِ کلام میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم تمام شعرائے دہلی کا کلام باوجود استقام لفظی کے تاثیر سے خالی نہ تھا۔ موضوع ومضمون کی پستی و

وبلندی کی کوئی تخصیص نہیں ۔کلام کی تاثیر کا اصلی راز صداقت جذبات ہے ۔حمد و منقبت کو رسم و تکلف سے نظم کر دینا ممکن ہے ۔ مذہبی حیثیت سے داخل ثواب ہو۔لیکن شاعری کے مذہب میں کوئی چیز جس میں دل کا اصلی جوش اور حقیقی تقاضا نہ شامل ہو کفر جلی سے کم نہیں۔شاعر کی دردمندی منفعت دُنیاوی تو ایک طرف اُمیدِ ثواب کی بھی محتاج نہیں ۔ اس کے یہاں مقصد شناسی خود فوتِ مقصد کا باعث ہوتی ہے ؎

بہائے دردو الم دردو غم کی لذت ہے
وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

شاعر کا دماغ اشعار کی صُورت گری کرتا ہے ۔مگر اس پیکر میں رُوح پھونکنا اس کے بے لوث اور پُر خلوص جذبات کا کام ہے ۔لکھنؤ کے وہ شعرا جو دہلی کی اس عام ذہنیت کو لئے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے ۔اُن کے کلام میں تاثیر کا بڑا راز یہی ہے ۔مرثیہ گو شعرا کے عقائد اور مرثیہ گوئی کے لوازم کچھ بھی ہوں ۔لیکن واقعۂ شہادت بجائے خود اس قدر دردناک ہے ۔کہ شیعہ سنی تو ایک طرف اس کی تاثیر کے لئے مُسلم و غیر مُسلم تک کی شرط امتیاز نہیں ۔ طبیعت کی گدازی جذبات کی رقت ، دردمندیٔ دل کی علامت ہے ۔جو عام انسانیت کے نزدیک یکساں طور پر مستحسن و محمود ہے ۔اس لحاظ سے دلی کے مرثیہ گو شعراء کے لئے جن کی غرض و غایت اگر مصائب امام پر اشک افشانی تھی ۔تو دلّی کا ماحول اس کے لئے کافی طور پر معین تھا ۔البتہ لکھنؤ پہنچ کر بظاہر اس مقصد کے لئے زیادہ سامان فراہم ہوگیا ۔مگر واقعہ یہ ہے ۔کہ یہی سامان

رفتہ رفتہ ان کی شاعرانہ قوتوں کے اضمحلال و انحطاط کا باعث بھی ہوا۔ اب لکھنؤ کی فضا پر ایک افرڈالو سلطنت کا مذہب شیعہ تھا۔ امراء و اعیان ریاست سب اسی مشرب کے حلقہ بگوش تھے۔ رونا رولانا دافضل حسنات سمجھا جاتا تھا۔ اور یہی چیز حصول منفعت کا بھی ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ دولت و ثروت نے عام طبائع میں ہنگامۂ عیش و نشاط برپا کر رکھا تھا خصوصاً جان عالم پیا کی رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں کی داستان کسے نہیں معلوم آئے دن کے مشاعرے، روز روز کی مجلسیں، فارغ البالی کے ضمن میں منجملہ سامان عشرت تھیں۔ امراء و رؤسا ہمت افزائیاں کرتے تھے۔ شعرا نے بھی جان توڑ توڑ کر زور لگائے۔ ایک ایک مضمون کو ہزار ہا انداز سے باندھتے۔ مختلف صنعتیں دکھائی جاتیں، بڑے بڑے مجمعوں میں یہ بھی ضرور ہوتی۔ کہ عوام کی واہ واہ سے حوصلوں میں بلندی و بالیدگی پیدا کی جائے عوام کے سطحی مذاق کی رسائی ضلع جگت اور لفظی رعایتوں کے آگے کیا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ عموماً انہیں چیزوں پہ واہ واہ سبحان اللہ کا شور مچ جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کسی خوش مذاق شخص نے میر انیس سے یہ شکایت کی کہ آپ بھی لفظی رعایتوں کا بہت لحاظ فرمانے لگے۔ میر صاحب نے فرمایا۔ کہ بھئی کیا کریں۔ لکھنؤ میں رہنا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مجلسی اور محفلی شاعر کو مذاق عوام اور حالات حاضرہ کا کس حد تک ساتھ دینا پڑتا ہے۔

سوز و درد

غرضیکہ اس چہل پہل اور اس گرمیٔ محفل میں سوز و درد کا کیا ذکر تحسین و آفرین

کے لئے نہ رویا جاتا ہے۔ اور نہ "فیس پر آہیں" کی جاسکتی ہیں۔ حسرت وبیکسی۔ درد والم کے الفاظ کو مشاقی سے نظم کر دینے سے کلام میں درد نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے لئے شاعر کی کیفیت نفسی بھی ایک ضروری جزو ہے۔ چنانچہ وہ اگر موجود ہو تو تاثیر و گداز کے لئے چند ٹوٹے پھوٹے جملے بھی کافی ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہی کیفیت نفسی کچھ اور ہو تو باوجود ہزار ہا صناعیوں کے کلام اثر سے خالی ہوتا ہے۔ دولت و ثروت کی اُن ہنگامہ زائیوں پر غور کرو جو عیش و نشاط کی غفلتوں کے ساتھ اودھ کے انحطاط و بربادی کا ہیولیٰ تیار کر رہی تھیں۔ اسی سے عام کیفیت نفسی اور اس کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی کا یہ تقاضا تھا۔ کہ مرثیوں میں ساقی نامہ اور سراپا وغیرہ کے پہلو پیدا کئے گئے۔ اور اس طرح طبیعت کی اصلی کیفیت نے مزے لے لے کر بہت کچھ رنگینیوں کا حق ادا کر دیا۔ لیکن مرثیہ آخر مرثیہ تھا۔ اصل موضوع کے پُر درد ہونے کو کیا کیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سوز و درد کی نقالی ہونے لگی۔ اور غم و الم کا تمسخر شروع ہو گیا۔ ایک ایسے شخص کا تصور کرو۔ جسے مسرت انگیز عشرتیں گدگدا رہی ہوں۔ اور جس کی پُر نشاط شوخیاں نچلی نہ بیٹھتی ہوں۔ مگر وہ ایک سوگوار شخص کی نقل کرنے بیٹھ جائے۔ اب وہ رنج سے مُنہ بسورتا ہے۔ تو متبسم ہونٹھ کلیوں کی طرح کھلنے لگتے ہیں۔ وہ چیختا ہے مگر چیخ قہقہہ بن جاتی ہے۔ اس طرح اس کی تمام گریہ وزاری۔ گریہ وزاری کی ایک مستقل توہین و تذلیل کر رہ جاتی ہے۔

مرثیے کا اثر دیگر اصناف سخن پر

یہی وجہ ہے کہ مرثیوں کا بڑا حصہ تکلف و تصنع سے گرانبار ہے۔ لیکن مرثیے

اور مجالس کی کثرت رواج سے طبیعتوں پر اس کا غلبہ اتنا قوی ہو گیا۔ کہ اگر غائر نظر سے دیکھیں۔ تو تمام اصنافِ سخن پر ہمیں اسی کی جھلک نظر آئیگی۔ مثلاً غزل کے معنی "از معشوق سخن گفتن" کے کیے جاتے ہیں۔ آزاد و بے قید طبائع کے نزدیک اس کا مفہوم "ہوس پرستانہ مشاغل کا اعتراف و اعلان" ہے۔ اس قسم کے کسی عام لکھنوی شاعر کی وہ غزل اُٹھا کر دیکھو جس میں وہ اشتیاق و محبت کے اظہار پر اُتر آیا ہو لیکن اُس کا یہ اشتیاق مرثیت کے تلازموں سے اس قدر مشتمل ہو گا۔ کہ تم اُس کی حقیقی کیفیتِ دل کا کسی طرح صحیح اندازہ نہ کر سکو گے۔ وہ اپنے ان اشتہاءاتِ شباب کو لفظ "مرنے" سے تعبیر کرے گا۔ پھر اس کے اور تمام لوازم "نبض کا چھوٹنا" "منکا ڈھلنا" "نزع کی ہچکیاں" "میتِ جنازہ" انتہا یہ کہ "شمعِ لحد" "تربت" اور "سیوم کے پھول" وغیرہ جمع کر دے گا۔ حالانکہ شاعر کے پاس جا کر ان تمام ہنگاموں کی حقیقت معلوم کرو۔ تو یہ کسی بالاخانے پر خفیف سی "دل لگی" نکلے گی۔ اور بس۔ غرضکہ ظاہر ہے۔ کہ اس طرح نہ جوشِ نقاط کی حقیقی ترجمانی ہو سکتی تھی اور نہ سوز و درد کی۔ اب جو چیز لے دیکر باقی رہ جاتی ہے۔ وہ "کاوش مشق" اور "بے جا صناعی" اس پر سر دھننے کے لئے اگر فرصت ہو تو ہزار ہا دفتر سیاہ کیے جا سکتے ہیں +

اظہارِ نفرت

دُشمنانِ اہلِ بیت یعنی قاتلانِ امام سے اظہارِ نفرت واقعہ کا لازمی جزو ہے لیکن اس نفرت پر گہرا ہست رنگ دینے کے لئے کہیں کہیں شہداء کی اہانت تک کی بھی پروا نہیں کی گئی۔ ۶

گوشت خاکِ ماہم بر باد رفتہ باشد

اس کے علاوہ صحابہ رسول پر سب ستم کے لئے پہلو پیدا کئے گئے۔ اور اس طرح مرثیہ کو شیعی معتقدات کا پروپیگنڈا بنانے کی کوشش ہونے لگی۔ جانِ عالم واجد علی شاہ کا مجموعہ مراثی ہمارے سامنے ہے اس میں خلفائے راشدین اور ازواج مطہرات کی شان میں جیسے سخیف شرمناک الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تہذیب وشائستگی اس کے اعادہ کی اجازت نہیں دیتی۔ بادشاہ وقت کے مذاق سے عوام کی حالتوں کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے ؎

بہ نیم بیضہ کہ سلطاں ستم روا دارد
زنند لشکریانش ہزار مرغ بر سیخ

مذہب واخلاق کی رو سے یہ روش اچھی ہو یا بُری ایک ادبی نقاد کی حیثیت واعظ ومناظر کی نہیں لیکن جو امور خود شعریت اور تاثیر شعریت کے لئے برباد کن ہوں۔ اُن کا ذکر اس محاکمہ وتبصرہ میں ناگزیر ہے۔

مرثیہ میں واقعہ نگاری کا یہ ضروری تقاضا ہے۔ کہ شدائد ومظالم کے تمام جزئیات بھی دکھائے جائیں۔ بلکہ ایک شاعر کو اس کی اجازت دینا بھی چاہئے کہ اشعار میں جوش وتاثیر پیدا کرنے کے لئے تصرفات بھی کرے۔ اس لئے کہ شاعر نہ مؤرخ ہے اور نہ سیرت نگار۔ لیکن تصرف اور انتخاب جزئیات میں شاعر کے حسن مذاق کی ضرورت ہے۔ جس طرح ایک مصور کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا نقشہ کھینچ دے۔ بلکہ اس کا اصلی کمال یہ ہے۔ کہ تصویر کے لئے انہیں جزئیات کو منتخب کرے جو تصویر کے حسن وخوبی کو بڑھاتی ہوں۔ اور تصویر دیکھنے والے

کے ذہن پر بجائے کراہت کے پسندیدہ نقش مرتسم کرتی ہوں۔ اسی طرح شاعر کا بھی فرض ہے۔ کہ واقعہ میں انہیں جزئیات کو نمایاں کرے۔ جو بہ حیثیت مجموعی کلام کے علو و شائستگی میں مزاحم نہ ہوں۔ جوش مذہبیت اور واقعہ نگاری کی دھن میں اگر کلام کی لطافت و متانت ضائع ہوگئی۔ تو عام تہذیب و انسانیت تو ایک طرف یہ امر خود نظم و شعر کی تاثیر و دلکشی کے بھی منافی ہے +

اس خاص معاملہ میں میر انیس سے زیادہ کوئی اور مرثیہ گو محتاط نہیں کہا جاتا لیکن مذاق عامہ کی قوت دیکھئے کہ ان کا کلام بھی ان عیوب سے بالکلیہ پاک نہیں۔ مرثیوں کے علاوہ "ہرسیے" کی ایجاد کا بھی بڑا مقصد یہی تھا۔ خود لفظ ہرسیہ جو ہرسہ سے ماخوذ بتلایا جاتا ہے۔ جس بلیغ معنویت کا حامل ہے۔ اس کی تفصیل کی حاجت نہیں۔ میں اس غیر خوش آئند فرض سے عمداً سرسری طور سے گذر جانا چاہتا ہوں۔ بلکہ مذکورہ بیان کے لئے سنداً اُن اشعار کے اقتباسات بھی دینا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ اندیشہ ہے۔ کہ یہ چیز بھی "اشاعتِ منافرت" ہی کے ضمن میں آجائے گی۔ اسی خیال سے ان منتخب مجلدات میں بھی اس قسم کے بند عموماً چھوڑ دئے گئے +

اخلاقی مضامین

اہل بیت اطہار دودمانِ رسالت کے چشم و چراغ تھے۔ اُنہوں نے اخلاق و مذہب کے گہوارے میں پرورش پائی تھی۔ اُن کی پوری ہستی اخلاق اور اعلےٰ کیریکٹر کا ایک مجسمہ تھی۔ کربلا کے مصائب و ابتلا نے اُن کے اصلی کمالات کو اس طرح نمایاں کردیا تھا جس طرح آنچ اور کسن سے سونے اور ہیرے کا جوہر نکھر

آتا ہے۔ اس لئے ان واقعات کے سلسلہ بیان میں قدرتی طور سے اخلاق و شریفانہ جذبات کو اُبھارنے کا موقع آجاتا ہے۔ بیٹے کی جاں نثاری۔ بھائی اور بہن کی رفاقت و محبت۔ اعزا کی وفادارانہ جانبازی۔ اعوان و انصار کا خلوص و ایثار غرضیکہ وہ تمام اخلاقی محاسن جن پر ایک اعلےٰ انسانیت کا دارومدار ہے ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں۔ اگر ان عبرو بصائر کو انیس و دبیر ایسے قادر الکلام شعراء کا قلم بھی میّسر آجائے تو ظاہر ہے کہ انسانی اخلاق و اعمال کا مرتبہ کس درجہ بلند ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ یعنی ان محاسن و کمالات کا تذکرہ بھی بکثرت ہوا۔ اور انیس و دبیر کے قلم نے افسوں طرازیاں بھی کیں لیکن مگر دورِ تنزل کی چابک دستیاں دیکھو۔ کہ اس نے ان تمام تیروں کو جو دل پر بیٹھتے تو خدا جانے کیا سے کیا کر دیتے "تیر ہوائی" بنا دیا۔ یعنی اخلاقی محاسن کا وہ کل شاندار تذکرہ جوش عمل پیدا کرنے سے یک لخت قاصر رہا۔ اور لکھنؤ کا عیش پرستانہ دورِ انحطاط اس سے ایک پست و مصنوعی زندگی کے سوا کچھ اور حاصل نہ کر سکا۔ مولانا حالی اپنے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں:۔

"مگر افسوس ہے کہ جو اثر ایسی اخلاقی نظموں سے انسان کے دل پر ہونا چاہئے۔ وہ نہ ان مرثیوں کے سامعین کے دل پر ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اوّل تو یہ خیال کہ مرثیہ کا اصل مقصد رونا اور رلانا ہے سامعین کو دوسری طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا۔ دوسرے یہ اعتقاد کہ (جو کچھ صبر و استقلال

شجاعت وہمدردی، وفاداری وغیرت وحمیت وعزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمام اور ان کے عزیزوں اور دوستوں سے معرکہ کربلا میں ظاہر ہوئے۔ وہ مافوقِ فطرت بشری اور خوارقِ عادات سے تھے، کبھی ان کی پیروی اور اقتدا کرنے کا تصور بھی دل میں آنے نہیں دیتا"۔

مولانا کے اس بیان کی تصدیق میرانیس کے ایک مرثیہ سے بھی حرف بحرف ہوتی ہے۔ یہ ایک معرکتہ الآرا مرثیہ ہے۔ اس میں حضرتِ امام حسین علیہ السلام کے مناقب اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

پیاسے رہے دریا پہ مگر دم نہیں مارا چھڑا گئے سب خویش وپسر دم نہیں مارا
سرکار لٹی تین پہر دم نہیں مارا یوں صاف ہوا تیغوں سے گھر دم نہیں مارا

سب دل پہ گوارا کیا اس جبر کے صدقے
سر دے دیا سجدے میں ترے صبر کے صدقے

حضرت امام کے صبر وتسلیم کا یہ روشن کارنامہ دراصل اسی لئے قابل اشاعت بھی ہے کہ اس اسوۂ حسنہ کی تقلید واتباع کی جائے۔ مگر یہ مشکل ایک منطق سے اس طرح حل کی جاتی ہے ؎

تکلیف ہے انساں پہ علے قدرِ مراتب
تم ان کے لئے روؤ اگر رائے ہے صائب

یعنی یہ کہ وہ کمال اخلاق تو انہیں کے لئے تھا۔ ہمارے لئے صرف گریہ وزاری کافی ہے۔ اس کے بعد گوہر اشک کی گرانمایگی"، کا ذکر کرتے ہوئے یہ مشورہ

دبایا جاتا ہے

آنسو بھی نہ جاری ہوں تو غم اس کا نہ کھاؤ
آمادہ ہو اور شکل ہی رونے کی بناؤ

اس طرح ایک مقدس اور اعلےٰ شخصیت حسنِ عمل کی جو دشوار مثال قائم کر کے معترفین کے لئے تقلید اور اتباع کی مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے اس آسانی سے محفوظ و مصئون رہا جا سکتا ہے۔

رزمیات

کربلا کا واقعۂ خونیں جہاں تک اس کی حقیقت و صلیت کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کے لئے قیامت تک ایک تازہ زندگی کی بشارت ہے۔ لیکن ابتدا ابتدا میں کچھ تو سیاسی مصالح نے اس کے رنگ میں گہرائی اور شوخی پیدا کی۔ کچھ بعد میں ہمارے شعرا کی روایت آفرینیوں نے اسے غلو و مبالغہ سے ہم آویز کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ اس سے بلند و اعلےٰ صلاحیتیں جس میں رزمیہ اسپرٹ بھی داخل ہے ابیدار ہوتیں۔ اس میں ایک طرح کی "آف نیوٹ" سی پیدا ہو گئی۔ اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں اس شدت کے ساتھ تصنع آمیز مبالغہ صرف کیا جانے لگا۔ کہ واقعہ میں داستان امیر حمزہ کی سی شان پیدا ہو گئی۔ اور حریفوں کے داؤں پیچ بانک بنوٹ کی کرتب بازیاں بن کر رہ گئے۔

اُردو شاعری میں ایپک پوئم (رزمیہ نظم) کا فقدان جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ انیس و دبیر کے کلام سے رزمیہ نظم کے حصے منتخب

کرکے اپنے لئے فخر و مباہات کا سامان فراہم کریں۔ مگر بعضوں کے نزدیک جنگ کربلا رزمیہ نظم کے لئے سرے سے موزوں و مناسب ہی نہیں۔ اس لئے کہ رزمیہ نظم کی شرط اساسی یہ ہے۔ کہ شاعر کے ہیرو کو آخر میں فتح حاصل ہوتی ہو۔ لیکن یہاں بے دیگر مٹھی بھر انسانوں کی ایک بابرکت جماعت ہے۔ جسے اشقیا کی ایک باقاعدہ فوج تین روز تک محصور اور بے آب و دانہ رکھ کر شہید کردیتی ہے۔ اس میں رزمیہ شاعری کا کیا موقع؟ بعید نہیں۔ کہ ابتدا ابتدا میں میر خلیق و میاں دلگیر وغیرہ نے اسی خیال سے مرثیوں میں رزمیہ طمطراق کو روا نہ رکھا ہو۔ مولانا حالی نے بھی مرثیوں میں اس قسم کے زور و شور سے اختلاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مرثیے میں رزم و بزم اور فخر و خودستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا لمبی لمبی تمہیدیں اور توسلے باندھنے۔ گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے، مرثیے کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں، اور بعینہٖ ایسی بات ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے مرنے پر اظہارِ حزن و ملال کے بجائے اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار کرے۔ یہ ہم نہیں کہتے۔ کہ مرثیے کی ترتیب میں مطلق غور و فکر کرنا اور صنعتِ شاعری سے بالکل کام لینا نہ چاہئے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو شاعری کا سارا کمال زبان کی صفائی، مضمون کی سادگی و بے تکلفی کلام کے مؤثر بنانے اور آورد کو آمد کر دکھانے

میں صرف کرنا چاہیئے +

اسی کے ساتھ ساتھ مولانا یہ بھی لکھتے ہیں :- کہ

مرثیے کو صرف واقعہ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی
ایک مضمون کو دہراتے رہنا اگر محض بہ نیت حصول ثواب ہو تو کچھ
مضائقہ نہیں لیکن شاعری کے فرائض اس سے زیادہ ہونے چاہئیں

مولانا کے اُن ارشادات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُردو مرثیہ گوئی "ثوابِ مذہبی" اور "مقتضیات شاعری" کے باہمی کشاکش میں گرفتار رہی۔ شاعری کے جو مطالبات ہیں۔ انہیں "نیتِ حصولِ ثواب" کی سادگی گوارا نہیں کرتی۔ اور "فرائضِ شاعری کی وسعت" اس "تکرارِ مضمون" کی مخالف یعنی یہ کہ نہ شاعری کا صحیح طور پر حق ادا ہوا نہ حصول ثواب کا۔ اسی کے ہیرو کو انجام میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان تمام بیانات کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس تمام دفتر بے پایاں کے بارے میں کیا کہیں۔ لیکن یہ تمام بحثیں تو ایک طرف ہم تو اصولی طور پر لکھنؤ کے اس عہدِ ماضی پر جب نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہر چیز کو ایک صنعتی بے جان خاکہ پاتے ہیں۔ واقعہ کربلا کے ہیرو کو بظاہر شکست ہوئی۔ لیکن داستان گوئی کے میدان میں امیر حمزہ کا خون آشام خنجر پالنہور کا گرز گراں باوجود اپنی کامل فتحمندیوں کے رزمیہ حرارت پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہا؟ معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ رزمیہ جوش کی حقیقی استعداد کسی نوعیت واقعہ کی محتاج نہیں۔ قومی انحطاط و تنزل کے دور میں بڑے سے بڑے پُرجوش واقعہ کو پیش کرو۔ مگر طبیعتوں کا رُخ بے انتہا اسی طرف ہوگا کہ ؎

منیزہ منم دخت افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

اس لئے اُس دَورِ انحطاط میں کہ سوسائٹی عیش نفس کی سرشاریوں میں مبتلا تھی۔ اور لہو ولعب عشرت و نشاط کے جراثیم سلطنت اَودھ کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ شعرائے لکھنؤ نے جو کچھ کیا وہ فتوحات نظم کی آخری حد ہے۔ زمانے اور حالات کے تقاضے سے جو اجتماعی مذاق تیار ہوجاتا ہے۔ وہ مثل ایک مستقل دماغ کے ہوتا ہے۔ اور افراد و اشخاص کی حیثیت مثل اعضاء و جوارح کے ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک اعلےٰ سے اعلےٰ فرد بھی بالعموم اُس جماعتی ذہنیت کے حلقہ اثر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوز و درد۔ اخلاقی و رزمیہ اسپرٹ کی اگر تلاش ہے۔ تو اُسے وہاں کیوں دیکھتے ہو۔ جہاں قومی ادبار و انحطاط نے اس کی استعداد ہی فنا کردی تھی۔ قدیم یونانیوں کے مرمری بتوں کے اعضا و ساخت کا مقابلہ کسی بڑے سے بڑے قوی الجثہ پہلوان سے کرکے فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن اسی سلسلۂ تقابل میں اگر حرکت و جان کا سوال پیدا ہوجائے۔ تو اُسے قطعی بے محل سمجھنا ہوگا۔ اس لئے کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے رُوح و جان کوئی ایسی محسوس و مادی شئے بھی نہیں جس کی طرف کوئی کھلا کھلا اشارہ کیا جاسکے ؎

تن زجان و جان زتن مستور نیست لیک کس را دید جاں دستور نیست

اینٹ، چونے اور گارے سے عمارتیں تیار ہوتی ہیں لیکن معمار کی متعدد کیفیات ذہنی و استعدادِ ارادی کو کیونکر دکھایا جاسکتا ہے۔ جو اسی اینٹ چونے اور گارے کو

کبھی عالیشان محل کبھی مسجد اور کبھی امام باڑے سے موسوم کرنے کے قابل بنا دیتی ہے
لکھنؤ کا وہ دَور مرثیہ گوئی سوز و درد، بین و بکا کا ایک تماشائے عبرت سہی۔
مگر پھر بھی وہ ایک تماشا ہے ہنگامۂ جنگ اور رزمیہ سمجھے کی بھی کوئی کمی نہیں۔ مگر ان
سب کی مجموعی مثال اُس آتش بازی کی ہے۔ جو فضائے ہوائی میں ایک بسیط آتشین
چادر تو تیار کر سکتی ہے جس سے دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو سکتی ہیں۔ مگر
اس میں شمع کا سا وہ مسلسل و حقیقی گداز کہاں۔ جس کی بدولت علم و اخلاق کا درس
لیکر جائیں منور کی جا سکتی ہیں ۔
یہ ہیں وہ خیالات جو لکھنؤ کے اس دَورِ شاعری و مرثیہ گوئی پر آجکل کے ذہنوں
میں خطور کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اگر اُس دَور کے اُن تمام کارناموں سے
بالکلیہ انکار کیا جائے۔ جن سے اردو زبان آج اس مرتبے کو پہنچی ہے۔ تو یقیناً یہ
تعصب و بے انصافی کی ایک نہایت تاریک مثال ہوگی۔ انیس و دبیر انس و
تعشق ایسے باکمال اساتذہ فن کی بدولت فنِ زبان۔ محاورات اور قوتِ نظم کی
ترقیوں کے ساتھ بندشِ الفاظ میں صفائی و استواری جس درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔
اس سے اُردو شاعری ان بزرگوں کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔
آج انگریزی تعلیم نے اگر کچھ اور فضا پیدا کر دی ہے۔ اور کچھ باتیں ہمارے مذاق کی
اُس میں نہیں ملتیں۔ تو یہ جس طرح اثر و نتیجہ ہے۔ زمانہ موجودہ کے ماحول و ذہنیت
کا اسی طرح وہ بھی تقاضا تھا سلطنت اَودھ کے انہدام و انحطاط کا موجودہ مذاق اگر
اُس دَور کی شاعری کو مصنوعی بتاتا ہے۔ تو یہ کس نے کہا ہے کہ مصنوعی جنگ کے موقع
پر جو آلاتِ حرب و اسلحہ استعمال کئے گئے۔ وہ بھی بیکار ہیں۔ آج اگر ان مصنوعی یا نور،

سے تم تنگ آ گئے ہو۔ تو اُنہیں آلات و اسلحہ کو لیکر اپنے خلوص و سنجیدگی کے جوہر دکھاؤ۔ واقعۂ کربلا میں اَب بھی وُہی برقی زور بے تاب و بیدار ہے۔ جس سے اگر صحیح طور پر کام لیا جائے۔ تو یہی نہیں۔ کہ ہمارا مذاق اور ہمارا مرتبۂ شعر و ادب بلند ہو جائے گا۔ بلکہ ہم چاہیں تو اسی سے ہماری پوری ہستی و انسانیت میں ایک تازہ و شاداب رُوح بھی دوڑ سکتی ہے۔ فریقانہ نفسانیت اور اُس کی جھوٹی فتح یا کچھ بے ثبات مادّی و مُلکی مفاد کے لئے اسے پروپیگنڈا بنانا خود اس واقعہ کے اخلاقی و رُوحانی عظمت کی توہین ہے۔ اور توہین نہ سہی جب بھی اس کی آج ضرورت کہاں ہے۔ نہ اَب وہ بنی ہاشم و بنی اُمیّہ کی چشمک ہے۔ نہ خلافت و حکومت کا سوال۔ نہ مروانی فرمانروا باقی رہے۔ اور نہ اُن کا ظلم و استبداد موجودہ حالات کے اعتبار سے اس واقعہ کا تذکرہ علّامۂ اقبال کی طرح ایسے انداز میں بھی کیا جا سکتا ہے جس میں سوز و درد بھی ہو۔ اور اولوالعزمی و حوصلہ مندی بھی جس میں علوی خلاق کی شان بھی ہو۔ اور سرفروشانہ جد و جہد کی رُوح حیات بھی ؎

تیغ و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست
(علامہ اقبال)

ارا کین اردو مرکز

افرادِ مرثیہ کے اسمائے گرامی

۱۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ۔ حضرت امام حسینؑ کے نانا ۔

۲۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ۔ حضرت امام حسینؑ کے پدر بزرگوار ۔

۳۔ حضرت امام حسنؑ ۔ حضرت امام حسینؑ کے بڑے بھائی ۔

۴۔ حضرت عباسؓ ۔ حضرت امام حسینؑ کے سوتیلے بھائی ۔

۵۔ حضرت قاسمؑ ۔ حضرت امام حسنؑ کے صاحبزادے جو حضرت امام حسینؑ کے
کے ساتھ معرکہ کربلا میں شہید ہوئے ۔

۶۔ حضرت علی اکبرؓ ۔ حضرت امام حسینؑ کے صاحبزادے ۔

۷۔ حضرت امام زین العابدینؓ ۔ حضرت امام حسینؑ کے بڑے صاحبزادے
جو واقعہ کربلا کے وقت علیل تھے ۔

۸۔ حضرت علی اصغر ۔ حضرت امام حسینؑ کے شیر خوار صاحبزادے ۔

۹۔ محمد ابن حنفیہ ۔ حضرت امام حسینؑ کے سوتیلے بھائی ۔

۱۰۔ حضرت حُر ۔ یزید کی طرف کے ایک افسر فوج جو میدانِ کربلا میں
پہنچ کر حضرت امام حسینؑ کی طرف ہو گئے ۔ اور آپ کی جانب سے جنگ
کر کے شہید ہوئے

۱۱۔ حبیب ابن مظاہر ۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی جو حضرت

امام حسینؓ کے ساتھ میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

۱۲۔ حضرات عون و محمد۔ حضرت زینب رضؓ (حضرت امام حسینؓ کی ہمشیرہ) کے دو صاحبزادے۔

۱۳۔ حضرت مسلم بن عقیل۔ حضرت امام حسینؓ کے چچا زاد بھائی۔

۱۴۔ ہانی۔ کوفہ کا ایک باشندہ جو حضرت مسلم کو اپنے گھر میں پناہ دینے کے سبب حضرت مسلم کے ساتھ شہید ہوا۔

***

۱۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور حضرت فاطمہ زہرا کی والدہ مکرمہ

۲۔ حضرت فاطمہ زہرا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی یعنی حضرت امام حسینؓ کی والدۂ ماجدہ۔

۳۔ حضرت شہربانو۔ حضرت امام حسینؓ کی زوجہ محترمہ۔

۴۔ حضرت زینب۔ حضرت امام حسینؓ کی ہمشیرہ یعنی حضرات عون و محمد کی والدہ معظمہ۔

۵۔ حضرت صغریٰ۔ حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی جنہیں حضرت امام حسینؓ سفر کربلا میں اپنے ساتھ نہیں لائے۔

۶۔ حضرت سکینہ۔ حضرت امام حسینؓ کی دوسری صاحبزادی جو آپ کے ساتھ کربلا میں موجود تھیں۔

۷۔ حضرت کبریٰ۔ حضرت امام حسین کی صاحبزادی جن کی بابت مرثیہ نگاروں نے

کہا ہے کہ کربلا میں حضرت قاسم (حضرت امام حسنؑ کے صاحبزادے) سے عقد ہوا تھا۔

۸۔ حضرت ام کلثوم حضرت زینب کی بہن۔

۹۔ فضّہ۔ ایک لونڈی جو حضرت امام کے ساتھ تھی۔

۱۰۔ طوعہ۔ کوفہ کی ایک عورت جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے حضرت مسلم کو پناہ دی تھی۔

۱۱۔ رقیہ۔ حضرت مسلم کی زوجہ۔

۱۲۔ عبدالسلام و محمد۔ حضرت مسلم کے دو صاحبزادے جو میدان کربلا میں شہید ہوئے

فریقِ مخالف

۱۔ یزید۔ بنی امیہ کا ایک بادشاہ جس کی وجہ سے واقعہ کربلا ہوا۔

۲۔ ابنِ زیاد۔ گورنر کوفہ۔

۳۔ عمر ابنِ سعد۔ یزید کی فوج کا سپہ سالار۔

۴۔ شمر۔ قاتل حضرت امام حسینؑ

۵۔ خولی۔ نیزہ برداروں کا سردار جس نے حضرت امام کے سر مبارک کو نیزہ پر بلند کیا تھا۔

۶۔ ارزق شامی۔ شام کا ایک مشہور پہلوان جو حضرت قاسم کے ہاتھ سے معہ اپنے چار بیٹوں کے مارا گیا۔

مرثیہ نگاروں کے حالات

خلیق

میر حسن نام خلیق تخلص۔ آپ میر غلام حسن حسن (میر حسن مصنف مثنوی بدر منیر) کے صاحبزادہ اور میر انیس کے والد تھے۔

لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۶ برس کے سن سے شعر سخن کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔

فصیح

مرزا جعفر علی فصیح ساکن لکھنؤ محلہ وزیر گنج متصل گنیا شیخ گھاسی ولد مرزا ہادی حسین مذہب شیعہ شاگرد رشید شیخ امام بخش ناسخ ۱۲۲۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے ۱۵ برس کی عمر میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ خواجہ محمد جعفر مخمور کی وساطت سے شیخ غلام علی مصحفی کی خدمت میں اصلاح سخن کے لئے گئے۔ حسن اتفاق سے اس روز مصحفی سے ملاقات ہوئی۔ آپ کے شوق نے تحریک کی اور اسی روز شیخ امام بخش ناسخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ناسخ نے فرمایا تمہاری غزل تو سلام کا رنگ رکھتی ہے۔ ہر شعر تنبیہ ہے بہتر ہے کہ تم مرثیہ یا سلام کہا کرو۔ اس روز سے

سلام و مرثیہ کہنے لگے۔ آپ کے مراثی کی سات جلدیں ہیں۔ اور سلام و رباعیاں بہت ہیں۔ یہ سلام آپ کا بہت مشہور ہے۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے

کچھ زمانے کے بعد ایسا اتفاق ہوا۔ کہ ایک عجمی کے ساتھ کربلا معلے تشریف لے گئے۔ اور وہاں جا کر مدتوں روضہ حسین پر مرثیہ گوئی کے شغل میں مصروف رہے۔ ایک مثنوی آب و نمک علم اخلاق میں مثنوی من و سلوا کے رنگ میں اردو میں لکھی۔ جو بہت مقبول ہوئی۔ آخر خدامی روضہ معلے تقدیر سے مل گئی۔ بقیہ تمام عمر کربلائے معلےٰ میں قیام رہا۔ ۱۲۷۴ھ تک زندہ رہے اور لکھنؤ میں اس کے اعزا کے پاس خطوط آتے تھے۔ اس کے بعد پتہ نہیں ملتا۔ غالباً اسی سنہ میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک مرثیہ بہت مشہور رہے

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے

دلگیر

لالہ جھنگو لال قوم کائستھ سکسینہ دلگیر تخلص ناسخ کے شاگرد تھے۔ آخر میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا دیوان لکھنؤ کی موتی جھیل میں غرق کر دیا۔ پہلے تخلص طرب تھا۔ اب تخلص بھی بدل دیا۔ اور دلگیر تخلص رکھا۔ مرثیہ گوئی کرنے لگے۔ اور تمام عمر مداحی اہل بیت میں بسر کی۔

نقی

نواب باقر علی خاں اولاد میں نواب شجاع الدولہ بہادر کی عربی فارسی میں

فارغ التحصیل تھے فسانۂ عجائب کو نظم کیا تھا۔ مرثیہ کی پانچ جلدیں چھپوائی ہیں۔ ناسخ سے تلمذ تھا۔ ۱۲۹۶؁ھ میں انتقال کیا۔

ضمیر

سید مظفر حسین ولد میر قادر حسین ساکن بنگورہ ضلع گوڑگاواں۔ میر ضمیر کے والد میر قادر حسین نواب آصف الدولہ کے میاں الماس خواجہ سرائے شاہی کے ملازم تھے۔ اور میاں الماس کے ساتھ پہلے فیض آباد میں رہتے تھے۔ جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے مقام حکومت منتقل کر کے لکھنؤ کو بسایا۔ تو میر قادر حسین اور ان کے ساتھ ان کے فرزند میر ضمیر بھی لکھنؤ آئے فیض آباد ہی میں میر ضمیر کی مرثیہ گوئی کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ آپ میاں مصحفی کے شاگرد میر خلیق۔ میاں دلگیر اور مرزا فصیح کے معاصر تھے۔

رزم و سراپا انہیں کی ایجاد بتائی جاتی ہے۔ مرثیہ پڑھنے کا اولیں فخر بھی انہیں کو حاصل ہے۔ مرثیہ کے سلسلہ میں صنف "ہرسیہ" کی ایجاد کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے۔ "ہرسیہ" ہجو و مضحکات۔ طعن و تشنیع بلکہ شاید سب و شتم کی وہ مرثیہ نما نظم ہے جو بزعم خود دشمنان اہل بیت اور قاتلان خاندان رسالت کے شان میں کہی جاتی ہے ۱۲۷۱ ہجری بعہد واجد علی شاہ فرمانروائے اودھ وفات پائی۔

⁂

مرزا دبیر

مرزا سلامت علی دبیر ۱۱۔ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ ہجری کو بمقام دہلی محلہ بَلّی ماران میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام مرزا غلام حسین چودہ پندرہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی۔ مرثیہ میں میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد تھے طبیعت دقت پسند واقع ہوئی تھی۔ شکوہ لفظی کے زیادہ دلدادہ تھے۔

۲۔ محرم ۱۲۹۲ھ کو لکھنؤ میں مرزا صاحب نے انتقال فرمایا۔ اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے۔

میر انیس

میر ببر علی نام لڑکپن میں حزین تخلص کرتے تھے۔ مگر شیخ ناسخ نے انیس تخلص تجویز کیا۔

انیس ۱۲۱۶ھ ہجری محلہ گلاب باڑی شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ زمانۂ امجد علی شاہ میں میر خلیق اُن کے والد نے مستقل سکونت لکھنؤ میں اختیار کی جب سے یہ بھی لکھنؤ میں رہنے لگے۔ شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ زبان اور روزمرہ کی صفائی۔ لطیف تشبیہات و استعارات آپ کی خصوصیات ہیں۔ اور اصلیت یہ ہے۔ کہ آپ نے اس فن مرثیہ گوئی کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ مناظر قدرت و محاکات کی جتنی صحیح تصویر آپ نے کھینچی ہے۔ اس کی مثال مشکل سے کہیں اور مل سکتی ہے۔ آپ نے ۲۹ رمضان ۱۲۹۱ھ کو

دردِ سر اور تپ میں مبتلا ہو کر ۲۹ شوال یوم دوشنبہ کو انتقال فرمایا ۔

انس

میر مہر علی نام انس تخلص میر مستحسن خلیق کے بیٹے اور میر انیس کے بھائی تھے

مونس

میر نواب نام مونس تخلص میر انیس کے دوسرے بھائی تھے۔ اپنے والد میر خلیق کے بعد میر انیس سے مشورہ سخن لیتے تھے ۔

اوج

مرزا جعفر نام۔ اوج تخلص۔ تاریخ ولادت ۶۔ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ آپ مرزا دبیر کے صاحبزادے تھے۔ آخر عمر میں زیادہ تر عظیم آباد میں مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ اسہال کبدی میں مبتلا تھے۔ اسی حالت میں عظیم آباد تشریف لے گئے۔ مرض بڑھ گیا۔ بالآخر ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔

مرزا محمد ہادی صاحب رسوا جو مغربی زبانوں کے ماہر تھے۔ مرزا اوج کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ یورپ کے شعرا کا کلام مرزا اوج کو اکثر سناتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا اوج نے اپنے مرثیوں کا رنگ بدلا۔ نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبیں بھی مرثیے میں داخل کیں۔ دور از قیاس مبالغے بھی کم کئے ۔

آپ دلی کا مذاق اور لکھنؤ کی زبان پسند فرماتے تھے - ایک جگہ کہتے ہیں ؎

شہرت ہر ایک شعر میں اس گفتگو کی ہے
دلی کا ہے مذاق زباں لکھنؤ کی ہے

شعرائے دلی میں غالب اور داغ کو اور لکھنؤ والوں میں آتش و صبا کو زیادہ پسند کرتے تھے +

نفیس

میر خورشید علی نام نفیس تخلص - میر انیس کے بڑے صاحبزادے تھے پچاس برس کے سن میں ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ ہجری مطابق ۱۹۰۱ء کو انتقال کیا۔

حسین مرزا

حسین مرزا صاحب عشق مشہور مرثیہ گو تھے - میر رشید صاحب کے چچا تھے - رکاب گنج دال کی منڈی لکھنؤ میں رہتے تھے +

سید محمد مرزا

سید محمد مرزا نام تخلص تعشق غزل گو اور مرثیہ گو شاعر تھے رکاب گنج میں رہتے تھے - میر الحسن کے بھائی تھے +

رشید

سید محمد مصطفےٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید لکھنوی۔ آپ سید احمد مرزا صابر کے صاحبزادے ہیں۔ جو میر انیس کے داماد تھے۔ یعنی جناب رشید میر انیس کے نواسے تھے۔ آپ کی پیدائش ابتدائے جلوس واجد علی شاہ میں ہوئی تھی۔ جناب رشید کے ددھیالے خاندان میں سید حسین مرزا عشق بڑے نامور مرثیہ گو تھے۔ جو ان کے والد کے چچا تھے۔ اس طرح جناب تعشق جو شعرائے لکھنؤ میں غزل گوئی میں لاجواب اور بے مثل سمجھے جاتے تھے۔ جناب رشید کے کلام میں اُنہیں دونوں صاحبوں کے کلام کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ انکسار و تواضع میں بھی شاعرانہ مبالغہ کو بہت دخل تھا۔ گفتگو میں بھی بہت تکلف برتتے تھے۔ اپنی امتیازی حیثیت ہر حال میں مدِّ نظر رہتی تھی۔ الغرض لکھنؤ کے تکلف و تصنع کی ایک زندہ یادگار تھے۔

رئیس

میر عسکری نام رئیس تخلص۔ یہ بھی میر انیس کے صاحبزادے تھے۔ پچاس برس کے سن میں ۱۳۔ ذیقعد ۱۳۱۸ہجری مطابق ۱۹۰۱ء کو انتقال کیا۔

سلیس

میر محمد نام سلیس تخلص ۔ میر انیس کے صاحبزادے اور میر نفیس کے چھوٹے بھائی تھے ۔

میر وحید

تخلص وحید ۔ نام سید ہادی صاحب ۔ میر مہر علی انس کے صاحبزادے تھے ۔ سنہ ۱۳۰۶ ہجری میں انتقال کیا ۔

علی میاں

مولوی علی میاں کامل ابن مولوی سید علی صاحب سیاہ فام مجہریرہ بدن ۔ فارغ التحصیل تھے ۔ فارسی ۔ اُردو میں قصاید بہت لکھے غزل گوئی بھی کی ۔ آخر میں مرثیہ کہنے لگے ۔ اور خوب کہتے تھے ۔ ان کا کلام نواب رستم علی خاں رئیس آگرہ کے پاس تھا ۔ اور کچھ غزلیں مرزا محمد علی مرحوم کے پاس تھیں پایہ ناز سے اپنے مکان میں گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے ۔ آخر میں دق ہو گئی تھی ۔ اور اسی میں انتقال کیا ۔

امین

حاجی محمد تقی صاحب امین ۔ مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے لکھنؤ

سے کربلائے معلّٰی کو ہجرت کر گئے تھے۔ علمائے عراق میں امین العلماء کے لقب سے مشہور تھے۔ لیاقت علمی میں فاضل اور پیش نماز بھی تھے +

صفدر

صفدر تخلص۔ میر صفدر علی صاحب نام۔ ضلع فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ اگرچہ شاگرد مرزا دبیر کے تھے۔ مگر مرزا دبیر کے بعد آپ نے مرزا اوج کو بھی اپنا کلام دکھایا ۱۳۰۰ھ کے قریب انتقال کیا +

جلیس

سید ابو محمد لکھنوی خلف الصدق جناب سلیس و نبیرہ میر انیس تھے + غزل اور مرثیہ گوئی دونوں میں جناب پیارے صاحب رشید سے اصلاح لیتے تھے۔ بعارضہ یرقان ۲۴ جمادی الاول ۱۳۲۵ھ کو انتقال کیا۔ اور اپنے دادا میر انیس کے پہلو میں دفن ہوئے +

فہرست

پیامِ زندگی

جلد اوّل

روانگی	۲
داخلہ	۳
شب کربلا	۴
صبح شہادت	۵
شہادت حضرت مسلم و فرزندانِ مسلم	۶

روانگی و داخلہ

میر خلیق	۱۰
نواب واجد علی شاہ اختر والی اودھ	۱۲
میر دلگیر	۱۴
مرزا دبیر	۱۷
میر انیس	۲۲
میر مونس	۲۸

روانگی و داخلہ

میر نفیس	۸۸

شہادت حضرت مسلمؓ

میر ضمیر	۹۵
حضرت تشفی	۱۰۲
میر مونس	۱۱۰

شہادت فرزندان حضرت مسلمؓ

حضرت فصیح	۱۱۹
میر دلگیر	۱۲۲
حضرت تشفی	۱۲۶
مرزا دبیر	۱۳۷
میر انیس	۱۴۲
میر مونس	۱۴۵

روانگی

(حضرت امام حسینؓ کی روانگی مدینہ منورہ سے کوفہ کو)

سیدالشہدا حضرت امام حسینؑ اس موسم میں جب کہ

"لو چلتی ہے خاک اُڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام"

اہل وعیال سمیت کوفہ کے جانے کو تیار ہوتے ہیں۔ آپ کی چھوٹی صاحبزادی حضرت سکینہؓ بھی ساتھ چلنے کے لیئے اصرار کرتی ہیں۔ مگر چونکہ یہ اس وقت صاحب فراش اور سفر کی اذیتوں کو برداشت کرنے کے ناقابل تھیں۔ اس لیئے مصلحتاً انہیں گھر ہی میں دادی کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ اس مقام پر مرثیہ نگار شعرا نے بہت زور طبع صرف کیا ہے۔ واقعہ بجائے خود نہایت پرتاثیر ہے۔ ایک خاندان کی چہیتی اور ناز پروردہ بچی کا یکایک صرف ماں باپ بلکہ تمام اعزا و اقارب سے جدا ہو جانا کچھ معنی رکھتا ہے۔ قوتِ بیان کی سحر کاریوں نے اس واقعہ کو اور بھی دلسوز و دل گداز بنا دیا ہے۔

بیٹی کو تسلی دے کر آپ روضۂ نبوی پر آخری زیارت کو حاضر ہوئے۔ اعتکاف سے فارغ ہو کر مکۂ معظمہ پہنچے۔ وہاں کچھ دن ٹھہر کر آگے کو روانہ ہو گئے۔ انصار و اعزا کی ایک بابرکت جماعت آپ کے ساتھ ساتھ ہے۔

داخلہ

یہ مختصر سا قافلہ صعوبات موسم و مصائب سفر برداشت کرتا ہوا آخر کار سرزمین کربلا میں پہنچ گیا۔ سامنے دریائے فرات میں آب حیات لہریں مار رہا ہے۔ پانی میں بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے تھکے ہوئے مسافروں کے لیئے دم عیسائی سے کم نہیں۔ گرمی کی

آتش ناک لو اور تپتے ہوئے موسم میں اس سے بہتر جگہ کا ملنا دشوار تھا۔ چنانچہ حضرت امام رفقا کو یہاں ٹھہرنے کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ حکم کے ساتھ رفقا اونٹوں سے اُترنے شروع ہوئے۔ اور خیام حسینی ترائی میں نصب ہونے لگے۔ اتنے میں لشکر شام کا ایک دستہ قریب سے نمودار ہو کر آپ کو ترائی میں اُترنے سے روکتا ہے بحر اس دستے کا سپہ سالار ہے۔ حضرت عباسؑ کو (جو امام عالیجاہ کے برادر خورد ہیں) یہ مداخلت بیجا ناگوار گزرتی ہے۔ معاملہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وقت حضرت امام حسینؑ ضبط و حلم سے کام لیتے ہوئے مغلوب الغضب بھائی کو تلقین صبر فرماتے ہیں اور ترائی سے دور ایک ایسے مقام پر جہاں اِردگرد پانی کا نشان تک نہیں۔ لاولشکر سمیت اُتر پڑتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ابنِ سعد بھی اپنی خونخوار جماعت کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا ہے اور خیام حسینی ان انسان نما درندوں کی چمکتی ہوئی بھالوں اور خون آشام نیزوں سے گھر جاتے ہیں۔

شب کربلا

رات کی بھیانک تاریکی۔ درندوں کی زہرہ ریز صدائیں۔ شور قرنا و ناقوس لشکر یزید کے غل سے سیدانیوں کے دل کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ دودھ پیتے بچے ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹے جاتے ہیں۔ ہوا کے جھکڑ آندھی کی شکل میں نمودار ہو کر خیام حسینی سے ٹکراتے ہیں۔ انصار امام آنے والی صبح کے انتظار میں رات آنکھوں میں گذار دیتے ہیں۔ خود امام پاک بچوں اور مخدرات عظام کی دل جوئی میں شب تیرہ و تار کی جانکاہ ساعتوں کو بسر کرتے ہیں۔

صبح شہادت

آخر وہ صبح نمودار ہوتی ہے۔ جس کی روشنی میں بے گناہ روحوں کی قربانی دی گئی۔ بے دست و پا اور لب تشنہ بچوں پر مظالم توڑے گئے۔ آلِ رسولؐ کے مذہبی وقار کو پائے استحقار سے ٹھکرادیا گیا۔ اور حالت تشنگی و ابتلا میں سیدانیوں کے صبر و تحمل کا امتحان لیا گیا۔ سب سے پہلے لشکر شام کی جانب سے تیر باری ہوتی ہے۔ امام علیہ السّلام بطور تکمیلِ حجّت فوج شام سے مخاطب ہو کر انہیں دنیا و آخرت میں امتیازی فرق دکھاتے ہیں۔ مگر غنیم پر جو ہر بات کا جواب زبانِ شمشیر سے دینا چاہتا ہے۔ اِن نصائح کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ انصار و اعزّا اور خود امام پاک یکے بعد دیگرے سرفروشانہ میدانِ جنگ میں اُترتے ہیں۔ اور کُلّ من علیھا فان کے چشمۂ شیریں سے جامِ شہادت نوش کر کے دُنیائے فانی سے دار البقا میں پہنچ جاتے ہیں۔

شہادت حضرت مسلمؓ و فرزندانِ مسلمؓ

حضرت مسلمؓ بن عقیل حضرت امام حسین علیہ السّلام کے عم زاد بھائی تھے۔ حضرت امام حسینؑ کے متعلق ان کے فداکارانہ جذباتِ اخوت کا صحیح اندازہ آج کی مادی دُنیا نہیں کر سکے گی۔ کیوں کہ بے غرض محبّت کے الفاظ اس دورِ مادہ پرستی میں مہمل اور ڈکشنری سے نکال دینے کے قابل بن گئے ہیں۔ لیکن دنیا ہمیشہ مادہ ہی کی غلام نہیں رہی ہے۔ کبھی کبھی اس پر روحانیت کے سیلاب بھی آئے ہیں اور ایسی طُغیانی سے آئے ہیں۔ کہ مادیت اور مادہ پرستی کے تر و خشک کو بہالے گئے ہیں اس ظلمت کدۂ ہستی میں سدا تاریکی ہی نہیں چھائی رہی ہے۔ خلوص و صداقت کے آفتاب بھی کبھی طلوع ہوئے ہیں۔ اور اِس جاہ و جلال سے طلوع ہوئے ہیں۔ کہ اس کے گوشے گوشے کو اپنی درخشانیوں سے جگمگا جگمگا دیا ہے۔ انہیں حُسنِ اتفاقات میں سے پیغمبر اسلام علیہ السّلام اور ان کے رنج و راحت کے شریک رفقا و اقارب کا زرّیں عہد بھی تھا۔ اِس مبارک عہد نے دنیا کے سامنے روحانیت و اخلاق کے ایسے ایسے روح افروز مناظر پیش کئے ہیں کہ مستقبل کی تاریخ ہمیشہ انہیں قلمبند کرنے سے محروم رہیگی۔ یہ وہ وقت تھا جب النسانیت اپنے بلند ترین رتبہ پر پہنچ گئی تھی۔ اور یہ وہ برگزیدہ لوگ تھے۔ جنھوں نے اپنی مثال پیش کر کے دنیا کو معیاری انسان بننے کی ترغیب دی۔ جن کی محبّت و عداوت دونوں ذاتی اغراض سے پاک تھیں جنھوں نے اپنے تمام جذبات کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا تھا۔ اس مقدّس گروہ میں تاریخ کو ایسے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ بیٹا بیٹی۔ دوست۔ احباب۔ آقا غلام ملینگے

جن پر انسانیت ہمیشہ فخر اور ملوکیت رشک کرے گی۔

آج بھی جب کہ کہا جاتا ہے۔ کہ دنیا حد نظر تک ترقی کر آئی ہے چچیرے بھائی ہر خاندان میں ملتے ہیں۔ لیکن عموماً ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے خواہاں — ایک دوسرے کے خلاف جذبات رشک و حسد میں تباہ۔ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں سرگرم۔

مسلمؓ بن عقیل حضرت امام حسینؑ کے چچیرے بھائی تھے۔ مگر ایسے؟ کہ آج حقیقی بھائیوں میں بھی ایک دوسرے کے لئے ایسی بے غرض محبت۔ اطاعت اور جاں نثاری نایاب ہے۔

اہل کوفہ کی بے بنیاد اطاعت شعاری کے دعووں سے متاثر ہو کر امام حسینؑ نے اپنے برادر عم زاد حضرت مسلمؓ بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر اس لئے کوفہ روانہ کیا — کہ وہاں پہنچ کر کوفہ اور کوفہ والوں کے حالات سے آگاہ کریں — اور حالات موافق نظر آئیں تو اطلاع دیں تاکہ حضرت امام بہ نفسِ نفیس وہاں تشریف لے جا کر عامہ مسلمین کو رشد و ہدایت فرمائیں۔

حضرت مسلمؓ آپ کے ایما پر اپنے دونوں صاحب زادوں کو لے کر کوفہ روانہ ہو گئے۔ کوفہ پہنچے۔ تو کوفہ والوں نے عقیدت مندانہ استقبال کیا — ہزاروں کی تعداد میں آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ ان کی بے بنیاد ارادت کیشیوں سے حضرت مسلم دھوکا کھا گئے — اور امام حسین علیہ السلام کو اس سفر کی توقع سے بڑھ کر کامیابی کے حالات بھیج دئے۔ حضرت امام آپ کے تسلی آمیز خطوط سے متاثر ہو کر مدینہ منورہ سے روانہ ہو گئے۔ ادھر

بہ سفیر حسینی بڑی بیدردی سے شہید کردے گئے۔

غالباً جبھی سے یہ ضرب المثل رائج ہوئی ہے کہ

"الکوفی لایوفی"

یعنی کوفہ کا رہنے والا بے وفا ہوتا ہے ــــ اس میں شک نہیں کہ کوفہ والوں نے اُس وقت جس قسم کی شرم ناک مہمان آزادی کا ثبوت دیا تاریخ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

مرثیہ نگار شعراء نے اس دردناک واقعہ کو سرسری طور سے کچھ ہی زیادہ لکھا ہے حالانکہ کتاب شہادت کا یہ بھی ایک دردناک باب ہے۔ حضرت مسلمؓ کے واقعہ شہادت سے زیادہ دل گداز ان کے یتیم، معصوم اور کمسن بچّوں کی شہادت کا واقعہ ہے۔ جسے کوئی سخت دل سے سخت دل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔ اس واقعہ الم ریز کو قلمبند کرتے ہوئے مرثیہ نگاروں کے نالہ ہائے منظوم سے خون ٹپکا پڑتا ہے۔

حضرت مسلمؓ کا کوفہ پہنچنا۔ کوفہ والوں کا آپکی آمد پر عقیدتمندانہ استقبال۔ ایک جم غفیر کا آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا یہ ایسے واقعات نہ تھے کہ حریفان کینہ پرور کو انکی اطلاع نہ ہوتی۔ اور اطلاع کے بعد وہ تن بہ تقدیر خاموش ہو جاتے۔ ابنِ زیاد نے خبر پاتے ہی حاکم شام کو حضرت مسلمؓ کی گرفتاری پر مامور کر دیا۔ کوفہ والے حکومت کے رعب اقتدار میں آکر آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ پر ایک بیکسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اس عالم بیکسی میں اس بات سے بیحد متاسف ہوتے ہیں کہ میری تسلی آمیز اطلاعوں سے حضرت امام ان غداروں کی غداری سے بیخبر کوفہ کو روانہ ہو چکے ہونگے۔ ادھر اپنے معصوم بچّوں کی بیکسی کا خیال دل کو خون رُلاتا۔ ایک طرف کوفہ کے نیتہ اروں کی بیوفائی سے پریشان ہوتے۔ غرض خیالات رنج والم کی کشاکش میں آپ "ہانی" کے مکان میں

پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ "ہانی" کے مکان کی تلاشی ہوتی ہے۔ اور "ہانی" اور حضرت مسلم دونوں شہید کر دیئے جاتے ہیں۔ حضرت مسلم کے ساتھ اُن کے دو صاحبزادے بھی ہیں۔ جو حضرت مسلم کی شہادت کے بعد سراسیمہ و پریشان ہو کر کسی جانب فرار ہوتے ہیں۔ ایک ضعیفہ اِن بچوں کی حالت پر ترس کھا کر اُنہیں اپنے مکان میں پناہ دیتی ہے۔ ضعیفہ کا لڑکا (اور بعض مرثیہ گویوں کے نزدیک ضعیفہ کا شوہر) انعام کے لالچ میں اِن بچوں کی تلاش میں مصروف ہے۔ شب کو تھکا ماندہ اپنے مکان پر آتا ہے۔ اِس اثنا میں حضرت مسلم کے صاحبزادے جنہیں ضعیفہ نے کھلا پلا کر ایک حجرہ میں پوشیدہ طور پر سُلا دیا تھا۔ اپنے پدر بزرگوار اور آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خواب میں دیکھتے ہیں۔ اس سے اِن بچوں پر رقت و گریہ طاری ہوتا ہے۔ بچوں کی آواز سن کر ضعیفہ کا لڑکا (یا شوہر) حجرہ کھولکر اِن بچوں کو گرفتار کرتا ہے۔ ضعیفہ بچوں کو چھوڑ دینے کی منت و سماجت کرتی ہے وہ شخص جھنجھلا کر ضعیفہ کو معہ حضرت مسلم کے صاحبزادوں کے شہید کر دیتا ہے۔

میر خلیق

گھر سے جب بہرِ سفر سیدِ عالم[1] نکلے　　سر جھکائے ہوئے با دیدۂ پُرنم نکلے
خویش و فرزند کمر باندھ کے باہم نکلے　　رو کے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے
رات سے گریۂ زہرا[2] کی صدا آتی ہے
دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لیجاتی ہے

یہ بیاں کر کے چلے واں سے شہِ کون و مکاں　　بے کسی چہرہ پہ چھائی تھی تو آنسو تھے رواں
لوگ سر پیٹ کے اس دم ہوئے یوں گریہ کناں　　پیچھے تابوت کے جس طرح سے ہو شور و فغاں
غل تھا اے سیّدِ ذی جاہ خدا کو سونپا
اے مدینہ کے شہنشاہ خدا کو سونپا

تاثیرِ بیان

والیِ ملک عجب حال سے کرتا ہے سفر　　برکتیں اُٹھ گئیں خالی ہوئے ساداتؑ کے گھر
نہ وہ زینت رہی مسجد کی نہ زیبِ منبر　　وعظ ہر جمعہ کو اب کون کہیگا جا کر
اس طرح کا ہے کو مسجد میں اذاں ہوئیگی
اب جماعت کی نماز آہ کہاں ہوئیگی

ذاتِ شبیر تھی اک رحمتِ ربِ باری　　کون اب دکھ میں غریبوں کی کریگا یاری

---

[1] سیدِ عالم سے مراد یہاں حضرت امام حسین ہیں [2] زہرا سے مطلب حضرت فاطمہ زہرا بنت رسول اللہ [3] یہ چند بند میر مونس کے مرثیہ میں بھی موجود ہیں مگر "الفضل للمتقدم" پر لحاظ کر کے خلیق ہی کے مرثیے میں رہنے دیا [4] شہ کون و مکاں سے مراد حضرت امام حسین ہیں [5] سیدِ ذی جاہ اور مدینہ کے شہنشاہ سے بھی حضرت امام حسین مراد ہیں۔

فیض کس گھر سے مدینہ میں رہیگا جاری　　پائیں گے کس کی دعاؤں سے شفا آزاری

شہر سے سایہ الطاف خدا جاتا ہے

مشکلیں باقی ہیں اور عقدہ کشا جاتا ہے

راہ میں شاہ کو تھا رنج صعوبات سفر　　سختیاں ہجر کی صغریٰ پہ گذرتی تھیں ادھر

تارے گن گن کے شب تار کو کرتی تھی سحر　　ہائے اماں تھا کبھی لب پہ کبھی ہائے پدر

اس مصیبت سے اُسے ہجر کا دن کٹتا تھا

کہ پہ ستاروں کا دیکھے سے جگر پھٹتا تھا

محاکات

خالی جھولا کبھی اصغر کا جھلا کر روتی　　ننھے تکیے کبھی چھاتی سے لگا کر روتی

کبھی مسند شہ والا کی بچھا کر روتی　　علی اکبر کے مکاں میں کبھی آکر روتی

کبھی کبریٰ و سکینہ کا گلا کرتی تھی

ماں کے حجرے میں کبھی جا کے بکا کرتی تھی

کبھی کہتی تھی ہمیں بھول گئی اماں واہ　　جا کے واں خط بھی نہ بھیجا کوئی سبحان اللہ

کس سے قسمت کی بُرائی کا گلہ کیجئے آہ　　سب کی اُلفت ہے تمہیں ایک ہماری نہیں چاہ

لے گئیں اُن کو سفر میں جنہیں دختر جانا

ہم کو تو لونڈیوں کے بھی نہ برابر جانا

خط کبھی کاہے کو بھیجیں گے شہ نیک خصال　　مرگئی ہو ویگی صغریٰ انہیں ہوگا یہ خیال

زندگانی کا تو اپنی مجھے صدمہ ہے کمال　　خاک اس جینے پہ مرنے سے بھی بدتر ہو جو حال

گھل گیا غم سے بدن ضعف سے طاری اماں
صدقہ صغرا کا خبر لیجے ہماری اماں

کہا صغرا نے کہاں دن تو ہیں وعدے کے قریب
آگے دیکھوں گی دکھائیگا جو کچھ مجھ کو نصیب

جلد آئے کہیں محبوب الٰہی کا حبیب
اب تو اس رنج سے نانی مری حالت ہے عجیب

شہ سے کب ہوتا ہے ملنے کا قرینہ دیکھیں
کیا دکھاتا ہے محرم کا مہینہ دیکھیں

کر خلیق اب نہ یہاں دخترِ بیمار کے بین
ہر گلی کوچہ میں فریاد تھی یا شیون و شین

یاس و امید کے عالم میں ہر اک تھا بےچین
پھر یہ تفصیل سنایا کہ ہوئے قتل حسین

کچھ خبر اور نہ قاصد کی زبانی آئی
خط کے بدلے شہ بےکس کی سنانی آئی

نواب واجد علی شاہ اختر

نواب واجد علی شاہ فرمانروائے اودھ کے مراثی اگرچہ شاعرانہ حیثیت سے کوئی خاص درجہ نہیں رکھتے۔ لیکن مصائب امام پر شبستان عیش کے ایک تاجدار کی اشک افشانی قطع نظر ایک تاریخی یادگار کے نصبانی حیثیت سے بھی انسانی جذبات کی بوالعجبیوں کی ایک بہترین مثال ہے۔ سادہ سادہ طور پر جہاں واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔ وہاں پر درد جذبات کے خفیف خفیف آثار ملتے ہیں۔ لیکن یہ بات زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔ اور آگے

چل کر پھر وہی پرشکوہ اور دور از کار کاوشیں شروع ہوجاتی ہیں جو آورد اور تصنع کے اُس دورِ بے کیف کی اصلی خصوصیات ہیں۔ عنوانات مقررہ کے تحت میں ہم شاید ہر جگہ آپ کا کلام نہ پیش کرسکیں۔ لیکن ترتیب واقعات کو صدمہ پہنچائے بغیر ہم حتی الامکان یہ کوشش کریں گے کہ تاجدار اودھ کے نمونۂ کلام سے بھی ناظرین کو لطف اندوز ہونے کا موقعہ مل سکے۔

ماہ محرم کی عظمت

غم حسین سے نسبت نہیں کسی غم کو ۔۔۔ شرف خدا نے دیا شاہ دیں کے ماتم کو
عجیب مرتبہ حق نے دیا محرم کو ۔۔۔ ڈبو دیا اشک مصیبت نے آب زمزم کو

شروع سال میں ایک ماہِ غم یہی تو ہے
عزیزو باعثِ رنج و الم یہی تو ہے

اس کے بعد حضرت امام حسینؑ کے مصایب کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

حسینؑ در و میں ہیں اور حسن کو زہر دیا
چھٹا وطن سے نبی کا نواسا تنگ ہوا

پھر فرماتے ہیں کہ ؎

ہراس بڑھتا تھا ہر روزِ شاہِ والا کا ۔۔۔ خبر سے مسلم ناشاد کے وہ رنج ہوا
سفید ریشِ مبارک ہوئی تھی وا دروا ۔۔۔ حزین و غمکش و رنجیدہ شاہِ ہردوسرا

ایک جگہ حضرت امام حسین حضرت زینب سے یہ فرماتے ہیں کہ ؎

ہیں یہ کھینچے لئے جا رہی ہے مرگ وہاں　　جہاں نہ سقف نہ سایہ نہ کوئی سایہ کناں

اسی سلسلۂ بیان میں یہ بیت ملاحظہ ہو۔

بہن مقدر و قسمت سے کچھ نہیں چارا
نہ اُف کروں گا جو اک ایک پر چلے آرا

ایک جگہ صبح کربلا کا دہشتناک منظر اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

نمودِ صبحِ الم خیز جب ہوئی رن میں　　غضب کی حدّت و تیزی سمائی آہن میں
لہو نے جوش کیا نوجوانوں کے تن میں　　سکینہ لوٹ گئیں آ کے شہ کے دامن میں
ہراس چھا گیا سینوں میں دل لرزنے لگا
ضعیف خستہ ہوئے مضمحل لرزنے لگا

※

میر دلگیر

کوفے کے جانے کو شبیر جو تیار ہوئے　　چشم سے حالتِ صغریٰ پہ گہربار ہوئے
متوجہ طرفِ دخترِ بیمار ہوئے　　بولے ہم خواہشِ تقدیر سے ناچار ہوئے
امر گذرا ہے یہی مصلحت یار ہی میں
چھوڑ جائیں تجھے ہم شدّتِ بیماری میں

حضرت امام حسین صغریٰ کو سمجھاتے ہیں۔ حضرت صغریٰ ساتھ جانے کے لیے اصرار کرتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ آپ سے جدا رہ کر مجھ سے ضبط نہ ہو

لہ صغریٰ حضرت امام حسین کی صاحبزادی جنکو حضرت امام نے سفر میں اپنے ہمراہ نہیں لیا۔

سکے گا۔ حضرت امام اپنی صاحبزادی کو اس طرح تلقینِ صبر فرماتے ہیں۔

دشمن جاں تیرے بابا کا زمانہ ہی تمام
طعنہ زن صاف ترے منہ پہ کہیں گے یہ کلام
متحمل ہوئی فرقت کی نہ یہ بنت[1] امام
باپ کے جاتے ہی بس ترک کیا آب و طعام
دادی[2] کے طور سے ہرگز نہیں دکھ بھر سکتی
پوتی صابر[3] کی ہے اور صبر نہیں کر سکتی

حضرت صغریٰ جواب دیتی ہیں کہ:۔

ہو اگر اس میں خوشی آپ کی شاہِ ابرار[4]
رونا کیسا میں کروں آہ نہ گا ہے زنہار
آپ دروازے پہ منگوا لیجئے اپنا رہوار
دیکھئے کیسی خوشی سے تمہیں کرتی ہوں سوار
آپ کے صدقہ سے کامل ہوں میں غم سہنے میں
کیا کہوں زور نہیں آنسوؤں کے بہنے میں

کہہ کے یہ شاہ سے اس نے علی اکبر سے کہا
گھوڑا دروازے پہ منگواؤ مرے بابا کا
پھر یہ ماں بہنوں سے بولی وہ گرفتارِ بلا
اب سواری ہیں ہے تم سب کو تامل بیجا
میں تو کچھ کہتی نہیں اشک بہاتی کیوں ہو
دن بہت چڑھتا ہے تم دیر لگاتی کیوں ہو

سواریاں دروازے پر آگئیں۔ حضرت عباس حضرت زینب کو جناب امام کا ارشاد سناتے ہیں کہ آپ پہلے سوار ہوں۔

---

[1] "بنت امام" یعنی خود حضرت صغریٰ۔ [2] "دادی" سے اشارہ حضرت فاطمہ زہرا کی طرف ہے۔ [3] "صابر" یہاں حضرت علی مرتضےٰ کو کہا گیا ہے۔ [4] "شاہ ابرار" نیک لوگوں کے پادشاہ۔ یعنی حضرت امام حسین۔

سُن کے یہ اُس نے جو کی جانبِ بیمار نگاہ روکے تب فاطمہ صغرا نے کہا بسم اللہ
آئی ہودج کے قریں بنتِ امیرِ ذی جاہ دیکھتی کیا ہے کہ ہے فاطمہ صغرا ہمراہ
بوسے پیشانی بیمار پہ دے کر روئی
اپنی گودی میں بھتیجی کو وہ لے کر روئی

حضرت زینب اور حضرت صغرا میں باہم گفتگو ہوتی ہے حضرت زینب فرماتی ہیں کہ میرے بچے بھائی (حضرت امام حسین) پر نثار ہو جائیں۔ بیں یہی اُن کی شادی یہی اُن کا بیاہ سمجھتی ہوں۔

کہہ کے یہ زینب بے کس ہوئی ہودج میں سوار آئی محل کے قریں بانوئے شاہِ ابرار
طرف فاطمہ مادر نے جو دیکھا اک بار کہا صغرا نے کہ اسوار ہو بیٹی پہ نثار
میرے غم سے نہ کڑا ہو دل کو سنبھالو اماں
اپنے زانو پہ سکینہ کو بٹھالو اماں

لے "اُس نے" یعنی حضرت زینبؑ (حضرت امام حسین کی ہمشیرہ) لے "بنت امیر ذی جاہ" یعنی امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دختر اس سے بھی مراد حضرت زینب ہیں۔ لے غم سے کڑھنا" رنج سے دل ہی دل میں تکلیف اُٹھانا۔

مرزا دبیر

آغاز

وطن سے بے وطن ابن بتول ہوتا ہے بلا کا آل نبی پر نزول ہوتا ہے
یہ دل سے کہہ کے وہ صابر ملول ہوتا ہے تباہ خانۂ آل رسول ہوتا ہے
سوائے قبر ملے گا کہیں نہ چین تجھے
سفر قضا کا مبارک ہو اے حسین تجھے

اپنے دل سے حضرت امام حسین گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

انداز بیان

وہاں چلے ہیں ازل سے جو گھر ہمارا ہے مسافروں کے لئے موت نے سنوارا ہے
وہ برج نور ہے شبیر اُس کا تارا ہے ہم اُس مکاں کو ہیں پیارے ہمیں وہ پیارا ہے
سخی جنازے کا احسان کب اُٹھاتے ہیں
ہم اپنے پاؤں سے اپنی لحد کو جاتے ہیں

حضرت صغرا بہ لجاجت حضرت امام سے عرض کرتی ہیں کہ میری علالت کا خیال نہ فرمایئے۔ مجھے بھی ہمراہ لے چلئے۔

بہن سکینہ کو ہودج میں کیجئے اسوار پیادہ جاؤں گی میں کھینچتی شتر کی مہار

لہ بتول بمعنی قطع کرنے والی۔ چونکہ حضرت فاطمہ زہرا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دُنیا کو قطع وترک کئے ہوئے تھیں۔ اِس لئے آپ کا لقب بتول ہوا۔

خدا کے شیر کی پوتی ہوں گو کہ ہوں بیمار عطا کرینگے وہی مجھ کو طاقتِ رفتار

تمہارے اصغرِ معصوم کو کھلاؤں گی

سکینہ جان کا مُنہ ہاتھ میں دھلاؤں گی

حضرت امام حسین بیمار صاحبزادی کو ساتھ چلنے سے روکتے ہیں حضرت صغریٰ

مایوسی کے لہجہ میں فرماتی ہیں ؎

کوئی نہیں جو غم ہجر سے بچائے مجھے گری ہوں سب کی نظر سے خدا اُٹھائے مجھے

یہاں گرنے اور اُٹھانے کے التزام تضاد نے اصل جذبہ کا لطف کم کر دیا ہے۔

کوفے میں بہار آئی جو گلگشت چمن کو تازہ کیا ہر موج نے تقویم کہن کو

رگ رگ سے ملی نبض رواں گل کے بدن کو دنداں درِ شبنم ہوئے غنچہ کے دہن کو

ہر سرو بنا شکل زباں شوقِ سخن میں

فوّارے ہوئے رطب اللساں مدح چمن میں

کوفہ جو ہوا رشکِ چمن فصل چمن میں دُرِ عکس شفق سے ہوئے یاقوت عدن میں

بلبل کی طرح جان پڑی گل کے بدن میں دنداں درِ شبنم ہوئے غنچہ کے دہن میں

پر بلبلِ بستانِ نجف مرثیہ خواں تھا

زہرا کا چمن فصل بہاری میں خزاں تھا

سلطان بہاری نے تجمل جو دکھایا ہر غنچہ نے نقارہ غلامی کا بجایا

ہر برگ سے گل دست ادب باندھ کے آیا رومال شگوفے نے عسلامانہ ہلایا

ؑ خدا کے شیر یعنی اسد اللہ الغالب لقب ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا۔

یہ تیز روی کی کہ عرق آیا جبیں پر
تسبیح گری زاہد شبنم کی زمیں پر

پھرے کے قلم فرد نگہداشت اٹھالی
لالے کی سیاہی کی دوات اس نے نکالی
تا م گل سبزہ سے رہی فرد نہ خالی
بیمار تھی نرگس پہ لکھی اس کی بحالی

کیا بندۂ آزاد ملازم جز وکل تھے
تھے سرو پیادوں میں تو اسواروں میں گل تھے

اِس کے بعد زمین و آسمان کے لئے اس طرح سامان رزم تیار کرتے ہیں کہ شبنم شاخوں کی صیقل گری کرتی ہے۔ غنچوں کے خود صاف ہوتے ہیں آب رواں کی موجیں تلوار بنتی ہیں۔ سنبل زرہ تیار کرتی ہے۔ لالے کے رسالے کو داغوں کی سپر ملتی ہے۔ دوسری طرف خسرو باراں ہولکے رہوار تند پر سوار ہوتا ہے۔ رعد نقیب بنتا ہے۔ بجلی سنان ابر سپر اور قطرے پیکاں ہو جاتے ہیں اسپر فوج گلستاں کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ سبزے کی صف نیزے تان لیتی ہے پھر فرماتے ہیں کہ ؎

یاران چمن میں رہے ساماں یہ وغا کے
خورشید پڑا فیصلے کو بیچ میں آکے

ایک جگہ ہنگامہ بہار کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں

پیدا نہ زمیں تھی نہ کہیں چرخ عیاں تھا
سبزے میں یہ پنہاں تھی شفق میں وہ نہاں تھا

وہ مشک بدوش ابر کا ہر باغ میں آنا
وہ نہر چمن کا کہیں آنا کہیں جانا

وہ قمریوں کا سرو کے منبر پہ ترانا　　وہ بلبلوں کا صحفِ گل پڑھ کے سنانا
گلزار خوش و سبزہ خوش و آب و ہوا خوش
سب کو فے میں خوشنود ہیں کوئی نہیں ناخوش
ہے طبع کو فواروں کی مدحت کی روانی　　فوّارہ نمط جوش میں ہے موج معانی
بالائے فلک کرتا ہے یہ قطرہ فشانی　　ہاں گلشن انجم کو یہ پہنچاتا ہے پانی
آگے تو سحاب آتا تھا گردوں سے زمیں پر
برساتی ہے اب منہ کو زمیں چرخ بریں پر

ان بیجا کاوشوں اور بے محل رنگین نوائیوں کے بعد اب سفر کے متعلق فرماتے ہیں کہ :-

محاکات

گرمی میں مدینے سے سفر کرتے ہیں حضرت　　پاؤں سے ہم قبر کی سر کرتے ہیں حضرت
گہ یاس سے صحرا پہ نظر کرتے ہیں حضرت　　گاہے در دولت پہ گذر کرتے ہیں حضرت
ہے موسم گل حسن پہ گلزار جہاں ہے
سرو چمن فاطمہ یثرب سے رواں ہے

حضرت امام حسین آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مزار مبارک پہ پہنچ کر اس طرح دعا مانگتے ہیں۔

پُرتاثیر طرزِ دُعا

تب شاہ نے عمامہ دھرا قبر پہ اپنا　　اور کھول کے گیسو کو کہا یا رآلھا
اِس خاک میں جو نور ہے اُس نور کا صدقا　　دل میرا رہے گرد کدورت سے مبرا

اُمت کی بدی مجھ کو نہ اصلا نظر آئے
آنکھوں سے سوا تیرے نہ مولا نظر آئے

مرزا صاحب کی پرواز تخیل گویا زبان حال سے اس طرح حضرت امام حسینؑ سے دعا کراتی ہے۔

مقتول ہوا اٹھارہ برس کا میرا بیٹا — پر میں نہ کروں قتل جواں بیٹا کسی کا
رخسار سکینہ کے ہوں اور سیلیٔ اعدا — بن باپ کی بیٹی کو نہ ماروں میں طمانچا
گر شمر کا دِیدہ میرے ولدار پہ اُٹھے
یہ ہاتھ نہ میرا کسی بیمار پہ اُٹھے

یہ میں نہیں کہتا نہ ہو صغرا ہدف تیر — پر قتل نہ ہو ہاتھ سے میرے کوئی بے شیر
سر ننگے پھرے بلوے میں زینب مری ہمشیر — لوٹے نہ کسی پردہ نشیں کو تیرا شبیر
مرنے پہ مرے ہونٹ کھیں چوب جفا سے
لیکن نہ زباں بند ہو امت کی دعا سے

میر انیس

مرقع نگاری

فرزند پیمبر کا مدینہ سے سفر ہے
سادات کی بستی کے اُجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے
گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بسر ہے
گلرو[2] صفتِ غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورت گلدستہ کھڑے ہیں

رخصت کے لئے لوگ چلے آتے ہیں باہم
ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پُرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ[3] عالم
خُدّام کھڑے پیٹتے ہیں قبرِ نبی کے
روضہ پہ اداسی ہے رسولِ عربی کے

عورات محلہ چلی آتی ہیں بصد غم
کہتی ہیں یہ دن رحلت زہرا سے نہیں کم
پرسے کی طرح روتے کا غم ہوتا ہے ہر دم
فرش اُٹھتا ہے کیا چھپتی ہے گویا صفِ ماتم
غُل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینب
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینب

---

[1] "فرزند پیمبر" مراد حضرت امام حسین علیہ السلام [2] "گلرو" ہمراہیان امام کی خوبصورتی اور وجاہت کی طرف اشارہ ہے [3] مخدومۂ عالم سے مراد حضرت فاطمۃ زہرا ہیں۔ اور دلبرِ مخدومۂ عالم سے مراد حضرت امام حسین ہیں۔

گرمی کے یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں کبھی آگاہ انکو تو نہ لیجائیں سفر میں شہِ ذی جاہ

قطرہ بھی دم تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

حضرت زینب جواب دیتی ہیں۔

اماں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نہ جاتی فاقے بھی اگر ہونے تو غم اسکا نہ کھاتی
بھائی کی طرف دیکھ کے غش ہوتی ہی چھاتی بے جائے کوئی بات مجھے بن نہیں آتی

ظاہر میں تو مابین لحد سوتی ہیں اماں
میں خواب میں جب دیکھتی ہوں روتی ہیں اماں

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اسکو بچائے

جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دل ڈرتا ہے کیونکر اسے لیجاؤں سفر میں

مصائب سفر

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام

صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گذر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

حضرت صغریٰ فرماتی ہیں:۔

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں | اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں | قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
ہو جا نا خفا راہ میں گر روئے گی صغریٰ
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغریٰ

حضرت امام حسینؑ حضرت صغریٰ کو ساتھ لے چلنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس پر حضرت صغریٰ طنزیہ کہتی ہیں۔

صغریٰ نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار | سب کی یہی مرضی ہے کہ مرجائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار | اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب ہیں غمخوار
بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

اسی سلسلہ میں یہ بیت بھی خوب ہے

دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

اسی سلسلہ بیان میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا | جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا

سانس اُکھڑے گی جس وقت تو فریاد کرونگی | میں ہچکیاں لے لے کے تمہیں یاد کرونگی

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ | اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ

آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ روٹھی ہے بہن تم سے گلے اُسکو لگاؤ

چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو

لینے انہیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

حضرت صغریٰ کی والدہ فرماتی ہیں۔

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ وزاری صغرا مرا روتا ہے صدا اس کے تمہاری

وہ کانپتے ہاتھوں کو اُٹھا کر یہ پکاری آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم

اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی تپ ہے تجھے چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی

جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بے کس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے

تم ہو سو تمہیں طاقت گفتار نہیں ہے

حضرت صغریٰ کے متعلق اس قسم کے پُر گداز بند لکھکر پھر لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ آں حضرتؐ کے روضۂ مبارک پر رخصت طلب ہونے کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت امام حسین کا روضۂ نبوی سے خطاب۔

پیبدل شہِ دیں روضۂ احمد پہ سدھارے تربت[1] سے صدا آئی کہ آ آ مرے پیارے

تعویذ سے شبیر لپٹ کر یہ پکارے ملتا نہیں آرام نواسے کو تمہارے

خط کیا ہیں اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا

---

[1] زبان حال سے۔

آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

خادم کو کہیں امن کی اب جا نہیں ملتی
رخصت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی

دکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں ملتی
ہیں آپ جہاں راہ وہ اصلا نہیں ملتی

پابند مصیبت ہوں گرفتارِ بلا ہوں
خود پاؤں سے اپنے طرف قبر چلا ہوں

اسی سلسلہ میں یہ بیت خوب کہی ہے۔

قبریں بھی جدا ہیں تہ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لے جائے کہاں خاک ہماری

امام عالی جاہ لوگوں کو رخصت کرتے ہیں۔

قسمیں انہیں دیدیکے کہا شہ نے کہ جاؤ
تکلیف تمہیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ

اللہ کو سونپا تمہیں آنسو نہ بہاؤ
پھرنے کے نہیں ہم سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ

اُس بے کس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

حضرت امام سب کو رخصت کر کے مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں اور کچھ دن ٹھہر کر آگے کو روانہ ہوتے ہیں۔

عبرت پذیری

جاتے تھے دل افسردہ و غمگیں شہ ابرار
ہر گام پہ ہوتے تھے عیاں موت کے آثار

قبریں نظر آجاتی تھیں صحرا میں جو دو چار
فرماتے تھے شہ فاعتبروا یا اولی الابصار

جز خاک نہ ہوئیگا نشاں بھی بدنوں کا
انجام یہ ہے ہم سے غریب الوطنوں کا

احباب کہیں گھر ہے کہیں آپ کہیں ہیں
آگے تو زمیں پر تھے پر اب زیر زمیں ہیں
خالی ہیں مکاں آپ نہ خاک مکیں ہیں
جو دور ہی بیں رہتے تھے وہ اب پاس نہیں ہیں
حسرت یہ رہی ہو گی کہ پہنچے نہ وطن میں
کیا منہ کو لپیٹے ہوئے سوتے ہیں کفن میں

حضرت امام ایک مسافر سے راستہ پوچھتے ہیں۔ وہ اثنائے گفتگو میں سر زمین کربلا کا اس طرح ذکر کرتا ہے:۔

اک شیر ترائی میں یہ چلاتا ہے دن رات
کٹ جائیں گے یاں ہاتھ تیرے لال کے ہیہات
کیا حال کہوں نہر کا اے شاہ خوش اوقات
پانی تو نہیں شور پہ مشہور ہے یہ بات
طائر بھی دم تشنہ دہانی نہیں پیتے
وحشی کبھی یاں آن کے پانی نہیں پیتے

اس جا پہ اترتا ہے نہ دم لیتا ہے رہگیر
ہے شور کہ اس آب میں ہے آگ کی تاثیر
پیاسوں کے لیئے اسکی ہر اک موج ہے شمشیر
اس طرح ہوا چلتی ہے جس طرح چلیں تیر
بجھتی نہیں واں پیاس کسی تشنہ گلو کی
بو آتی ہے اس نہر کے پانی سے لہو کی

راستہ میں حضرت مسلم کی شہادت کی خبر ملتی ہے۔

حضرت نے دعا پڑھ کے یہ کی حق سے مناجات
کر رحم گنہ گاروں پہ اے قاضی حاجات
سر دینے کا مشتاق ہوں عالم ہے تیری ذات
خنجر میری آنکھوں میں پھرا کرتا ہے دن رات

باقی ہیں جو راتیں وہ عبادت میں بسر ہوں
یہ زیست کے دس دن تیری طاعت میں بسر ہوں

اسی سلسلہ میں حضرت زینب سے خطاب کرکے فرماتے ہیں۔

سر تن سے برادر اس سہ پُر غم میں کٹے گا
زینب یہ مہینہ تمہیں ماتم میں کٹے گا

یہ بیت بھی خوب ہے ؎

یہ بار امانت میری گردن سے اُتر جائے
ہو خاتمہ بالخیر جو سر تن سے اُتر جائے

گردوں پہ مہ نو جو نمایاں ہے یہ ہمشیر ۔ چڑھتی ہے میرے سر کیلئے چرخ پہ شمشیر
اس چاند میں لٹ جائیگا سب لشکر شبیر ۔ نیزہ کوئی کھائیگا کلیجہ پہ کوئی تیر
برچھی کسی جانباز کے پہلو پہ لگے گی
شمشیر کسی شیر کے بازو پہ لگے گی

جب طے کیا شہ نے سفر راہ خدا کو ۔ منزل پہ قضا لائی غریب الغربا کو
اک عید ہوئی عاشق رب دوسرا کو ۔ بس روک لو باگیں یہ پکارے رفقا کو
گردوں سے فزوں اوج ہے اس پاک زمیں کا
یاں سے نظر آتا ہے چمن خلد بریں کا

لہ غریب الغربا۔ عاشق رب دوسرا سے مراد حضرت امام حسین ہیں۔

اے قافلے والو یہ ٹھہرنے کی جگہ ہے　　خیمے کرو برپا یہ اُترنے کی جگہ ہے
دیں داروں کے یہ سر سے گذرنے کی جگہ ہے　　ہمت جو خُدا دے تو یہ مرنے کی جگہ ہے
ایسی نہ زمیں پھر تہ افلاک ملے گی
یہ خاک وہ ہے جس میں مری خاک ملے گی

کیا سبزۂ نوخیز ہے کیا خوب فضا ہے　　کیا چشمۂ شیریں ہے عجب سرد ہوا ہے
جنت کا نمونہ اِسے کہیئے تو بجا ہے　　آرام سے سونے کی اگر ہے تو یہ جا ہے
یوں غنچۂ خاطر متبسم ہوا کھل کر
خوش ہوتا ہے جیسے کوئی معشوق سے ملکر

دریا سے وضو کر کے مصلوں کو بچھاؤ　　سجدے میں سر اِس ارضِ مقدس پہ جھکاؤ
کھولو کمریں اب قدم آگے نہ بڑھاؤ　　حمّالوں کو دو حکم کہ اونٹوں کو بٹھاؤ
گھوڑے بھی تھکے ماندے ہیں زینوں کو اُتارو
محمل سے بس اب ناقہ نشینوں کو اُتارو

اُونٹوں سے نہ اُترا تھا ابھی خیمہ و خرگاہ　　صحرا سے ٹہلتے ہوئے دریا پہ گئے شاہ
تھے سارے عزیز و رفقا آپ کے ہمراہ　　گرد اختر تابندہ تھے اور بیچ میں وہ ماہ
صحرا پہ کبھی گاہ ترائی پہ نظر تھی
بیٹے پہ کبھی اور کبھی بھائی پہ نظر تھی

اکبر تو یہ کہتے تھے کہ صحرا پہ ہے عالم　　اپنی تو اِسی سمت نظر پڑتی ہے ہر دم
فرماتے تھے عباس ترائی بھی نہیں کم　　خیمہ ہو کہیں آن کے سوئیں گے یہیں ہم

۱؎ سر سے گذر جانے کا مطلب یہاں سر کٹا دینے سے ہے ۲؎ ترائی یعنی نشیب کی نمناک زمین۔

گرمی کے ہیں دن سرد ہوا بھاتی ہے اکثر
شیروں کو ترائی ہی میں نیند آتی ہے اکثر

ہوتی تھی چچا اور بھتیجے میں یہ تقریر منہ دیکھتے تھے دونوں کا اور روتے تھے شبّیر
رنگِ رُخِ عباس علی ہو گیا تغییر پوچھا سبب گریہ تو بولے شہ دلگیر
دریا جو میرے سامنے لہراتا ہے بھائی
دل خود بخود اس وقت بھر آتا ہے بھائی

وہ خیمہ وہ لشکر وہ بیاباں وہ ترائی اک قدرت اللہ کی تھی جلوہ نمائی
رونق چمن خلد کی اس دشت نے پائی ویرانے میں بستی ہوئی جنگل کی بن آئی[1]
کانٹوں کے جہاں ڈھیر تھے گلشن نظر آیا
پھولوں سے بھرا دشت کا دامن نظر آیا

سقّے گئے اور آنے لگا مشکوں میں پانی ترستے[2] ہوئے گھوڑوں کی بجھی تشنہ دہانی
موقوف اسی دن سے ہوئی تھی رسد آنی لشکر میں ہوئی شاہ کے، غلّہ کی گرانی
مہمانوں پہ رحم آیا نہ پیماں شکنوں کو
فاقوں کے پیام آنے لگے بے وطنوں کو

مسند کو شہ دیں نے منور کیا جا کر لینے لگی بھائی کی بلائیں بہن آکر
جا بیٹھی سکینہ بھی قدم جلد بڑھا کر کہنے لگی مُنہ شاہ کی چھاتی سے لگا کر
کس کس کے بُلانے کے لئے میں نے کہا تھا
بابا تمہیں کب سے مرا دل ڈھونڈ رہا تھا

---

۱ بن آئی یعنی تقدیر کھل گئی ۲ ترستے ہوئے یعنی پیاسے۔

کس بات کا اندیشہ ہے میں آپ کے قربان ‏ خاطر بھی پریشان ہے گیسو بھی پریشاں
سونے کی نہ ہے فکر نہ کھانے کا ہی کچھ دھیان ‏ کیا ہو گئے وہ لوگ کہ ہم جن کے ہیں مہماں
ہر مرتبہ کیوں اشکوں سے منہ دھوتے ہو بابا
کیا فاطمہ صغرا کے لئے روتے ہو بابا

حضرت نے کہا کچھ نہیں تشویش مری جان ‏ اللہ سے لازم ہے طلب خیر کی ہر آن
عاشق وہ ہے جو ہو رہ معشوق میں قربان ‏ اب آتے ہیں وہ لوگ کہ ہم جن کے ہیں مہمان
فارغ الم و رنج سے ہو سونے کے دن آئے
صدقے پدر اب چین سے سونے کے دن آئے

منہ دیکھ کے زینب کا یہ کہنے لگے شبیر ‏ پاتا ہوں بہت میں تمہیں افسردہ و دلگیر
کیوں آنکھیں ہیں سوجی ہوئی کیا روتی ہو ہمشیر ‏ ہے غم سے تمہارے مرا حال اور بھی تغیر
ہاتھوں سے نہ مادر کا چلن دیجیو بہنا
مرجائیگا شبیر تو رو لیجیو بہنا

زینب نے کہا شاد سے یا گریہ و زاری ‏ یہ کون سا صحرا ہے بہن ہو گئی واری
منہ ڈھانپ کے میں رو چکی ہوں یاں کئی باری ‏ گھبراتی تھی ڈر ڈر کے سکینہ مری پیاری
بانو کو بھی تشویش نے یاں گھیر لیا ہے
کچھ دودھ سے اصغر نے بھی منہ پھیر لیا ہے

حضرت امام حسین سے یہ سن کر کہ میدان کربلا اسی جگہ کا نام ہے حضرت زینب آہ و بکا کرتی ہوئی امام عالیجاہ سے عرض کرتی ہیں۔

طفلی سے مجھے یاں کی مصیبت کی خبر ہے ‏ اب مجھ پہ کھلا یہ وہی آفت کا سفر ہے

اس دشت میں تم مجھ سے بچھڑ جاؤ گے بھائی
گرخاک بھی چھانوں تو نہ ہاتھ آؤ گے بھائی
بھیّا کو مدینہ بھی نہ پہنچاؤ گے بھائی
میں دیکھوں گی اور برچھیاں تم کھاؤ گے بھائی
اولاد سے ماؤں کے یہ چھٹنے کی جگہ ہے
ناموس نبی کے یہی لٹنے کی جگہ ہے

لشکر غنیم کے سپہ سالار کی ہتک آمیز و گستاخانہ گفتگو سے حضرت عباس بپھر جاتے ہیں اور تلوار میان سے نکال کر آمادہ پیکار ہوتے ہیں حضرت امام حسین اطلاع پاکر انہیں تعلیم حلم دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

تم سا کوئی دنیا میں نہیں صاحب شمشیر
موقع نہیں غصہ کا ہر اک وقت مرے شیر

پھر فرماتے ہیں کہ ؎

لے تیغ چلے غیظ میں تم آ گئے بھائی
سر کٹنے کے مذکور پہ تھرا گئے بھائی
تیروں کا نشانہ جو بنائیں گے ستمگر
پھر تم سے بھلا صبر کیا جائیگا کیونکر
اس پیار سے معلوم یہ ہوتا ہے برادر
مرجاؤ گے جب تیغ کوئی کھینچے گا مجھ پر
لو بس کرو اتنا بھی کوئی روتا ہے بھائی
بھائی تو ابھی ذبح نہیں ہوتا ہے بھائی

غنیم کا جوش رزم

اڑتے تھے نشانوں کے پھریرے تو ہوا سے
اور گونجتا تھا دشت بھی گھوڑوں کی صدا سے
اندھیر کئی کوس تھا ڈھالوں کی گھٹا سے
سب تیغ زن اس پیاسے کے تھے خون کے پیاسے
غل تھا کہ نہ مہلت دو شہ جن و بشر کو

لہ مراد حضرت امام حسین سے ہے۔

سادات کا سر کاٹ کے کھولیں گے کمر کو

تانے ہوئے نیزوں کو سوار ایک طرف تھے تلواریں لیے ظلم شعار ایک طرف تھے
اور تیر فگن تیس ہزار ایک طرف تھے کوفے کے جواں باندھے قطار ایک طرف تھے

بدلی سپہ شام کی پیاسوں پہ جھکی تھی
شہ بیچ میں تھے چار طرف راہ رکی تھی

※

حریم کعبہ سے رخصت ہونے کے بعد حضرت امام حسین کی یہ حالت ہے کہ

جوں قبلہ نما قصد جدھر کرتے ہیں شبیر
پھر پھر کے سوئے کعبہ نظر کرتے ہیں شبیر

منزل پہ روانہ ہوا وہ خاصۂ باری گویا کہ بیاباں میں چلی بادِ بہاری
جنگل میں کھلا باغ یہ خوشبو ہوئی ساری فیاض نے صحرا کی بھی کی کار براری

چھٹکے جو وہ گیسو تو بیاباں کی بن آئی
نافے لیے جھولی میں نسیم ختن آئی

اہل قریہ کے رشد و ہدایت سے فارغ ہو کر حضرت امام آگے بڑھتے ہیں

صحرا میں گرمی کی شدت سے حضرت امام اور ان کے رفقا کا یہ عالم تھا۔

پھر تھے وہی صحرا وہی جنگل وہی کہسار بستی تھی نہ کوسوں نہ کہیں سایہ نہ اشجار
گرمی تھی کہ تھے نخل بھی سوکھے ہوئے بن کے مرجھا گئے تھے پھول محمد کے چمن کے

مناقب حسینی میں آپ کے اخلاق حسنہ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں

ے خاصۂ باری سے مراد حضرت امام حسین

قریوں سے زیارت کو جو آجاتی تھی خلقت   کرسی پہ نکل بیٹھتے تھے خیمہ سے حضرت
یکساں تھی ہر اک پر نظر لطف و عنایت   محتاجوں سے باتیں تھیں غریبوں سے محبت
ہر عاجز و بےکس کی مدد کرتے تھے مولا
درویش کا ہدیہ بھی نہ رد کرتے تھے مولا

وہ کوس کڑے اور پہاڑوں کی وہ راہیں   یہ دھوپ میں حدت تھی کہ جلتی تھیں نگاہیں
دشوار تھا پانی جو کسی چشمہ سے پائیں   اُٹھتا تھا دھواں دل سے نکل جاتی تھیں آہیں
سنولا[1] گئے تھے چاند سے مُنہ سیمبروں کے
ثابت تھا کہ خورشید برابر ہے سروں کے

چہروں پہ جوانان علی رو کے تھیں ڈھالیں   لو دیتی تھیں تیروں کی چمکتی ہوئی بھالیں
گرمی سے وہ کیونکر نہ زبانوں کو نکالیں   دھوپ اُن پہ جنہیں سائے میں سیدانیاں پالیں
اللہ رے تب و تاب بیابان بلا کی
پھولوں کا عرق کھنچتا تھا گرمی سے ہوا کی

بھرتا تھا دم سرد پریشاں کوئی ہو کے   دامن سے ہوا دیتا تھا مُنہ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لُوں سے ردا چہرے پہ رو کے   رکھ لیتا تھا سر پر کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزا دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چلو ہی سے پی لیتا تھا پانی

محمل سے نظر کر کے یداللہ کی جائی[2]   کہتی تھی کہ اللہ نے یہ شکل دکھائی
جس دن سے چھٹا گھر کہیں راحت نہیں پائی   فریاد بہن دھوپ میں سنولا گئے بھائی

---

۱ مائل بہ سیاہی تھے۔ ۲ مراد حضرت زینب سے ہے۔

کیا بن گئی جنگل میں امام دوسرا پر
سایہ بھی درختوں کا نہیں ظلِ* خدا پر

صدقے گئی جنگل کی زباب دھوپ میں چلئے دن کاٹیئے سایہ میں کہیں رات کو چلئے
منہ دھویئے دم لیجیئے پوشاک بدلئے لو[1] چلتی ہے آفت کی پہاڑوں سے نکلئے
ناشاد بہن آپ کی غربت پہ فدا ہو
بچہ کوئی گر تونس[1] کے مرجائے تو کیا ہو

اثنائے راہ میں حضرت امام کو ایک مسافر کی زبانی کوفہ کے حالات حضرت مسلم اور اُن کے صاحبزادوں کی سقیم حالت معلوم ہوتی ہے۔ جناب عباس حضرت کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔

پردیس میں ہونا تھا انہیں خاک کا پیوند جو مرضیٔ حق ہم ہیں بہر حال رضا مند
ہر طرح گذر جائیں گے یہ بھی نفس چند ہم ہوئیں کہ مسلم ہوں برادر ہوں کہ فرزند
یا ور ہیں تو کیا ہیں جو یگانے ہیں تو کیا ہیں
سب ناخنِ پائے شہ والا پہ فدا ہیں

اثنائے سلسلۂ گفتگو میں جناب امام کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسلم اور اُن کے صاحبزادے شہید کر دیئے گئے۔ تو آپ کی حالت متغیر ہو جاتی ہے۔

رنگ اُڑ گیا رخساروں سے تھرانے لگے شاہ اشک آنکھوں سے برسا کے کہا یرحمہ اللہ[2]
آفت کا سفر اور یہ ماتم کی خبر آہ برپا ہوئے خیمے وہیں اُترے شہ ذی جاہ

*. ظلِ خدا سے مراد حضرت امام حسین۔
[1] شدت تشنگی۔ [2] یرحمہ اللہ یعنی خدا اُس پر رحم کرے۔

لشکر پہ اُداسی تھی غریب الغربا کے
سب روتے تھے رونے پہ امام دوسرا[1] کے

اتنے میں دور سے کچھ سوار نظر آتے ہیں حضرت عباس پر آثار غضب طاری ہوتے ہیں لیکن حضرت امام آپ کو روک دیتے ہیں حر مع سواروں کے حاضر خدمت ہو کر پانی نہ ملنے کی وجہ سے اپنی اور اپنی فوج کی حالت بیان کرتا ہے حضرت با وجود قلت آب پیاسوں کو پانی پلانے کا حکم دیتے ہیں۔

مجمع ہوا پھر گرد شہنشاہ خوش انجام[2] بٹنے لگے پھر پیاسوں کو پانی کے بھرے جام
مصروف تھے اک سمت علی اکبر گلفام تقسیم ادھر کرتے تھے عباس نکو نام
فرزند بھی حیدر کے نواسے بھی بہم تھے
اک جا کئی سرچشمۂ دریائے کرم تھے

جان گئی جس وقت بجھی تشنہ دہانی گویا کہ ملا سوکھے ہوئے دھانوں کو پانی
وہ ہاتھ تھے یا آیۂ رحمت کی نشانی صحرا میں ہوئی فیض کے دریا کی روانی
تھا شور کہ افراط ہے یاں آب بقا کی
جنگل میں ملے خضر یہ قدرت ہے خدا کی

جتنے تھے الاغ و شتر و قاطر و رہوار سیراب ہوئے سب تو پھرے سید ابرار
کپڑوں کو ہوا دینے لگے شاہ کے انصار ساتھ آئے یہ کہتے ہوئے عباس خوش اطوار
پیاسے نہ اب اُشتر ہیں نہ شبدیز ہیں مولا
دو چار پکھالیں ابھی لبریز ہیں مولا

---

[1] غریب الغربا اور امام دوسرا سے مراد حضرت امام حسین ہیں [2] شہنشاہ خوش انجام سے مراد امام حسین ہیں۔

شکرِ باری تعالیٰ

فرمانے لگے سر کو جھکا کے شہِ عالم میں کیا ہوں یہ سب ہے کرم خالقِ اکرم
اس بحرِ کرم کا ہے مگر شکر مقدم پیاسے تھے فرس اور یہ پانی تھا بہت کم

بات آج دو عالم کے شہنشاہ نے رکھ لی
غربت میں مری آبرو اللہ نے رکھ لی

وہ چاہے تو اک قطرے کو دریا ابھی کر دے چشمہ جو ہو پنہاں اُسے پیدا ابھی کر دے
ذروں کو صدف کے دریکتا ابھی کر دے جس ہاتھ کو چاہے یدِ بیضا ابھی کر دے

گر اوج وہ بخشے تو زمیں عرشِ بریں ہو
ذرے پہ کرے مہر تو خورشید مبیں ہو

حضرت امام کو معلوم ہوا کہ حُرؔ آپ کی نگرانی کے لئے آیا ہے۔ آپ مکدر ہوتے ہیں۔ اور حضرت عباس اظہارِ غضب فرماتے ہیں۔ حُر لجاجت و ادب سے اپنی ذمہ داری کی مجبوریاں ظاہر کرتے ہیں۔ اور آپ کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ آپ کسی اور طرف چلے جائیں۔ آپ اس کی درخواست منظور فرما کر روانہ ہو جاتے ہیں۔

تھی طرفہ شبِ تار کہ تارے بھی تھے مستور اک پارہ ہے جبکا شبِ یلدا شبِ دیجور
دوڑے کہیں شدیز نظر کا تھا نہ مقدور ہوتا نہ تھا ثابت کوئی نزدیک ہے یا دور

حضرت پہ وہ اس تین پہر رات میں گذری
تکلیف سکندر[1] پہ جو ظلمات میں گذری

[1] مشہور ہے کہ سکندر ظلمات میں آبِ حیواں کے لئے سخت صعوبات اٹھا کر گیا۔

مگر اسے کرشمۂ تقدیر کہو یا ایک اتفاقی امر کہ سر پھر کر آپ پھر اسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ایک دن پہلے فروکش ہوئے تھے حضرت زینب اسے آل رسول کی تباہی کا پیش خیمہ سمجھ کر محو گریہ ہو جاتی ہیں۔ امام کلمات تسکین سے ناشاد بہن کی دلجوئی فرماتے ہیں۔

خواہر سے تسلی کا سخن پاس ہیں کہہ کر دریا پہ گئے واں سے ٹہلتے ہوئے سرور
اُترا ہوا تھا حرِّ جری واں مع لشکر قدموں پہ گرا وہ تو یہ بولے شہِ صفدر
پائی نہ کہیں شب کو جگہ امن و اماں کی
لائی وہیں تقدیر کہ تھی خاک جہاں کی

گرمی کی ہے یہ فصل تمازت کے ہیں یہ دن جھیلوں میں پڑے رہتے ہیں دشت کی ساکن
بھائی مرے ہمراہ ہیں بچے کئی کم سن بے نہر پہ اُترے مجھے راحت نہیں ممکن
پانی کی تو غربت میں نہ تکلیف سہوں میں
گر مشورہ تیرا ہو تو دریا پہ رہوں میں

کی عرض یہ حر نے کہ تصدق میں اگر بار میں منع کروں یہ میری طاقت نہیں زنہار
فوجیں لئے آتا ہے مگر شمر ستمگار ڈھونڈھیں گے سبھی نہر کا قرب اے شہ ابرار
تکرار نہ کچھ ہو مجھے ڈر ہے تو یہ ڈر ہے
شب سے پسر سعد کے آنے کی خبر ہے

عباس کا منہ دیکھ کے شہ بولے کہ اچھا جلتی ہوئی ریتی ہی پہ خیمہ کرو برپا
اُس شیر نے کی عرض کہ چھوڑینگے نہ دریا فوجیں ہیں تو کیا خوف ہے لشکر ہے تو پھر کیا
بہ جائے گا لاکھوں کا لہو تیغ دو دم سے
دریا کی ترائی کوئی لے سکتا ہے ہم سے

امام عالی مقام پر اثر نصائح سے مغلوب الغضب بھائی کی طبع مشتعل کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

خیمہ کی تعریف

سمجھا کے برادر کو پھرے سید بیکسؑ
میدان میں استادہ ہوا خیمۂ اقدس
اوج اُس کا جو دیکھا تو دیا چرخ مقرنس
خورشید نے رخساروں کو شمسے سے کیا مس
پر رنگ تھا اُس پہ فلکِ مہر شرف کا
جس طرح کہ مہتاب پہ دھبا ہے کلف کا

محاکات

محمل سے اُترنے جو لگی بنت یداللہ
تھیں چادریں روکے ہوئے سب لونڈیاں ہمراہ
خود بازو نے ہمشیر کو تھامے ہوئے تھے شاہؑ
اُس پردے پہ بھی سر کو جھکائے تھی وہ ذی جاہ
اُس دن تو یہ پردہ تھا یہ شوکت یہ حیا تھی
اک دن وہی زینب تھی کہ محتاج ردا تھی

خالی ہوئے وہ محمل و ہودج جو ہیں سارے
خیمہ میں چھپے عرش معلی کے ستارے
تارے بھی وہ تارے کہ جو اللہ کو پیارے
جن تاروں پہ انجم کو فلک صدقے اُتارے
جیسے قمر اس برج جہاں تاب میں دیکھے
یوسف نے وہ کوکب کبھی خواب میں دیکھے

حضرت امام حسین کو آمادۂ کوفہ دیکھ کر اہلِ مکہ آپ کو عزم سفر سے روکتے ہیں۔ امام عالی جاہ اسکے جواب میں فرماتے ہیں:۔

اس امر کے درپے ہے یزید ستم ایجاد — باقی رہے دنیا میں محمد کی نہ اولاد
ڈرتا ہوں یہاں قتل کرینگے مجھے جلاد — حرمت حرم کعبہ کی ہو جائے گی برباد

کعبہ میں سے میں نکلوں یہ گوارا مجھے کب ہے
ناچار ہوں دوری کا سبب پاسِ ادب ہے

مجاہد کا مرتبہ

حضرت امام حسین بوقتِ روانگی اپنے قافلے کی بے سروسامانی معصوم بچوں کی تشنہ دہانی، پرخطر راہ کی دشواری، حج کعبہ سے محرومی کے خیال سے متاثر ہوکر اور قبلہ کی جانب ہاتھ اُٹھاکر خدا سے فریاد کرتے ہیں۔

پاس آن کے در سے جو ترے دور چلا ہوں
تو عالم و دانا ہے کہ مجبور چلا ہوں

غیب سے آواز آتی ہے کہ:۔

کعبہ کی جدائی سے بہت ہوتے ہو مضطر — لیکن یہ بیاباں کا سفر فرض ہے تم پر
جس راہ میں جاتا ہے تو اے سبطِ پیمبر — ایک ایک قدم میں ہے ثواب حج اکبر

لہ "حرمت کعبہ" یعنی حرم کعبہ کی عظمت اشارہ اس احترام سے ہے جس کا حکم قرآن میں ہے۔
یعنی حرم میں جو داخل ہوں اُن کو امن ملے

حضرت محمد ابن حنیفہ امام حسین کو عزم سفر پر مصر دیکھ کر عرض کرتے کہ اس پر خطر سفر میں حضرت زینب کا ساتھ لیجانا تو کسی طرح مناسب نہیں کہ

پردیس میں کیا جانئے کیا جور و جفا ہو
ڈر ہے کہیں زینب نہ گرفتارِ بلا ہو

حضرت زینب بھی کہیں اس مشورہ کو سن پاتی ہیں حضرت محمد ابن حنیفہ سے طنزاً فرماتی ہیں ؎

کی تم نے سفارش مری کیا آہ برادر | بھائی سے چھڑاتے ہو مجھے آہ برادر
ہمراہ ہیں کاٹوں گی مصیبت کے سفر کو | تنہا نہیں چھوڑوں گی محمد کے جگر کو

میر انیس نے حضرت زینب کے خواہرانہ جذباتِ محبت کو ذیل کے بند میں قلم بند کیا ہے۔

اب گھر سے ہی مطلب نہ مدینے سے مجھے کام | وہ شہر ہے جس بن میں ہو زہرا کا گل اندام
میں یاں نہ رہوں گی مرے رہنے کا نہ لو نام | بھائی مجھے معلوم ہے اس کوچ کا انجام
بابا نے مرے ہاتھ میں ہاتھ اُن کا دیا ہے
اماں نے مجھے بھائی کے ہمراہ کیا ہے

حضرت شہر بانو اپنی لخت جگر صغریٰ کی جدائی اور پریشانی سے بیقرار ہو کر محمد ابن حنیفہ کی زبانی انہیں تسلی آمیز پیغام بھیجتی ہیں:۔

ہاں صدقے نہ تم آپ کو کُڑھ کُڑھ کے گھلانا[1] | ہمجھولیوں کو پاس محلے سے بُلانا
بابا کے لئے چھوڑ نہ دیجو کہیں کھانا | روٹھوں گی اگر میرا کہا تم نے نہ مانا

[1] کُڑھ کُڑھ کے گھلانا بمعنی دل ہی دل میں رنج کر کے خود کو کمزور کرنا۔

ایامِ جدائی بھی گذر جائیں گے بیٹی
اللہ جو پھیرے گا تو پھر آئیں گے بیٹی

اثنائے سفر میں قوم بنی جان" امام حسین سے فدا کارانہ انداز میں درخواست کرتی ہے۔ کہ آپ کس قوم سے لڑنے چلے ہیں۔ ہمیں اس کا پتہ بتائیے اور حکم دیجئے کہ ہم اس قوم سے جنگ کریں۔

جنگ اُن سے کریں دیجے ہمیں حکم وغا کا
جو آپ کا دشمن ہے وہ دشمن ہے خدا کا

امام حسین "بنی جان" کی درخواست نامنظور کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

شہ نے کہا شرم آتی ہے کیا نام بتاؤں   وہ امت احمد ہیں کیسا اُن کو سناؤں
غیر اُن کو جو سمجھوں تو بلانے پہ نہ جاؤں   سب مجھ کو گوارا ہے جو تکلیف اٹھاؤں

تلواریں بغیر اُن کے سرے خوں میں بھرے کون
قتل اُن کو کرو تم تو مجھے قتل کرے کون

مصائب سفر، گرما

ازبس متحمل تھے نہ گرمی کی تعب کے   سونلا گئے تھے رنگ جوانانِ عرب کے
خیمے کی نگہبانی کو جاگے جو تھے شب کے   شاہِ دوجہاں پیار سے منہ تکتے تھے سب کے

میداں تھا کفِ دست نہ سایہ نہ شجر تھا
ملتے تھے کوئیں خشک مصیبت کا سفر تھا

یہ دھوپ کی حدت تھی کہ تھے کوہ دہکتے   چنگاریوں سے ریت کے ذرے تھے چمکتے

تھے گودیوں میں ماؤں کے معصوم بلکتے [1] اور ماتھے سے قطرے تھے پسینے کے ٹپکتے

آرام سواری میں نہ لیتی تھی سکینہ
کرتے سے ہوا چہرے کو دیتی تھی سکینہ

ہے سرد ہوا کیسلئے جاں تن میں ترستی جلتی ہے زمیں چرخ سے ہے آگ نکلتی
ویرانہ ہے کوسوں نظر آتی نہیں بستی نزدیک ہی ہو جائے خزاں گلشن ہستی

واقف تھے کبھی کا ہے کو اس رنج و محن سے
کس فصل میں قسمت نے نکالا ہے وطن سے

اثنائے سفر میں حضرت مسلم کی شہادت کی خبر حضرت امام حسین کو ملتی ہے۔ اس خبر سے آپ کی حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ ؎

فرمایا کہ راحت میں ہماری خلل آیا
منزل پہ نہ پہنچے کہ پیام اجل آیا

آنکھوں میں بھرے اشک پھرے سیدؑ والا اونٹوں کو بٹھا کر وہیں خیمے کئے برپا
مظلومی پہ مسلم کے جو ٹکڑے تھا کلیجہ بھرتے تھے دم سرد شہ یثرب و بطحا

افسردہ تھے دل زرد تھے منہ پیر و جواں کے
لشکر میں اداسی تھی شہ کون و مکاں کے

جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا دشت بلا نمونۂ خلد بریں ہوا
سر جھک گیا فلک کا یہ اوج زمیں ہوا خورشید محو حسن حسینؑ حسیں ہوا

---

[1] بلکنا یعنی رونا۔

پایا فروغ نیّرِ دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے
یہ دشت ہولناک کہاں یہ چمن کہاں — جنگل کہاں بتول کے گل پیرہن کہاں
کنبہ کہاں نبی کا سوار محن کہاں — قبریں کہاں شکستہ دلوں کی وطن کہاں
آئے ہیں ڈھونڈھتے ہوئے اس ارضِ پاک کو
سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو
اترو مسافرو کہ سفر ہو چکا تمام — کوچ اب نہ ہوگا حشر تلک ہے یہیں مقام
مقتل یہی زمین ہے یہی مشہدِ امام — اونٹوں سے بار اتار کے برپا کرو خیام
بستر لگاؤ شوق سے اس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا اس کی خاک پر

ارضِ کربلا کی شان میں

سجدے کرینگے جس پہ ملک وہ زمیں یہ ہے — جس پر کھدا ہے نقشِ شفا وہ نگیں یہ ہے
بطحیٰ یہ ہے مدینۂ اربابِ دیں یہ ہے — کعبہ یہ ہے نجف یہ ہے خلدِ بریں یہ ہے
تھی اس زمیں کی قدر رسولانِ پاک کو
آنکھوں سے سب لگا گئے ہیں یاں کی خاک کو

اس کے بعد مناظر قدرت کی تصویر کھینچتے ہیں۔ جس کے ضمن میں قلبی تاثرات اور خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام — گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام — شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

اس کے بعد حضرت عباس پوچھتے ہیں کہ خیمے کہاں نصب کیے جائیں :-

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا — زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسِ باوفا — جا کر قریبِ محملِ زینب یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

حضرت زینب ارشاد فرماتی ہیں :-

عورت کے شریفانہ جذبات

بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار — اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل ہیں نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار — ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو
اترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر — کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر — دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اجاڑ تھا

ایک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا

حضرت زینب حضرت عباس کو سمجھاتی ہیں ؎

دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے
بھائی! بہن نثار، ذرا دیکھ بھال کے

لشکرِ یزید کی آمد کے آثار

تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار
کھلوا رہے تھے خیموں کو عباس ذی وقار
ناگہ اٹھا شمال کی جانب سے اک غبار
رایتِ[1] سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار
مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی
ڈنکے کی دشتِ ظلم سی کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آگئی
ایک ایک پیل زور تہمتن شکوہ تھا
ان سب کے آگے سبز قدم[2] سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباس باوفا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
آتے ہی سرکشی پہ طریقہ ہے کونسا
کہہ دو کہ اہل بیت کے خیمہ کی ہے یہ جا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

[1] رایت بمعنی نشان لشکر [2] سبز قدم بمعنی منحوس۔

لیکن فوجِ یزید کا رئیس کہتا ہے کہ وہ دریا سے الگ ہٹ کر قیام کریں
اور پھر اپنی فوجی قوت کی اس طرح نمایش کرتا ہے ؎

کوفے سے کل جوان دہر آئے ہیں دس ہزار
رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بے شمار
خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار
شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار
لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئیگا
گیتی ہلے گی جب پسرِ سعد آئیگا

ہم گھاٹ روکنے کیلئے آئے ہیں ادھر
ہے آج شب کو داخلہ شمر کی خبر
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

حضرت عباس کا جوشِ شجاعت

غصّے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم
گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
بھڑ ہیں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

تم کون ہو حسین ہے مختار خشک و تر
اُن کے سوا ہے کون شہنشاہِ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

کیا سر پہ موت آئی ہے بس سامنے سے جاؤ
فوجوں کا ذکر کر کے کسی اور کو ڈراؤ
دعویٰ ہے کچھ سپاہ گری کا اگر تو آؤ
بیٹا رحیم کا ہوں مجھے غیض میں نہ لاؤ
تلوار ادھر کھنچی کہ ادھر کھیت پڑ گیا
پھر کچھ نہ بن پڑے گا اگر میں بگڑ گیا

ہم شیر ہیں قسم اسد کردگار کی
رکھتے ہیں ناخنوں میں برش ذوالفقار کی
ہے سو کی اصل یاں نہ حقیقت ہزار کی
روکے یہ کیا مجال کسی نابکار کی
گرجیں ابھی تو رعد ہیں برسیں تو ابر ہیں
اک ہیں نہیں بہت ابھی ایسے ہزبر ہیں

چھوڑیں نہ یہ زمیں جو گرے سر پہ آسماں
بڑھ کر ہٹا نہیں کبھی اس فوج کا نشاں
جب تک کہ دم میں دم ہے نہ جائیگی آن بان
رکھیں پہ ہم بپا کریں خیمہ خدا کی شاں
مر جائیں وہ جو ساتھ کسی شیر خوار ہیں
ہاں واقعی ہم ایسے ہی تقصیر وار ہیں

حضرت عباس کا جوش کم ہو چلا ہے۔ اور وہ لشکر یزید کو آشتی سے فہمایش کرتے ہیں۔ ذیل کے بند اس تدریجی کیفیت کے اظہار کی بہترین مثال ہیں:-

آپ باوجود اپنے قدرتی تیکھے پن کے لشکر یزید کے لوگوں کو اس طرح غیرت دلاتے ہیں کہ

چھوڑ آئے ہیں تمہارے بلانے پہ اپنا شہر
کوئی مسافروں پہ بھی کرتا ہے جبر و قہر
اترے ابھی نہیں کہ لڑائی ٹھہر گئی
دعدے وہ کیا ہوئے وہ محبت کدھر گئی

ہم تو تمہیں سمجھتے ہیں سیّد کا خیر خواہ کیا خوب میہمانوں کی دعوت ہے، واہ واہ
الفت نہ دل دہی نہ تعارف نہ رسم و راہ ہم بھی سنیں وہ کون سا ایسا ہوا گناہ؟

چشمے پہ جنگ فاطمہ کے نورعین سے
نا منصفو پھراتے ہو آنکھیں حسین سے

زورِ بیان

ہر چند خاکسار ہیں فرزند بوتراب[1] پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کہنی تک آستیں کو جو الٹیں دمِ عتاب گردوں میں تھرتھرا کے چھپے قرص آفتاب

آجائے انقلاب کی آفت جہان پر
ہو آسماں زمیں پہ زمیں آسمان پر

حضرت عباس پھر جوش میں آجاتے ہیں :-

ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی جو سرکشی کرے اُسے پسپا کریں ابھی
اس سرزمیں کو خون کا دریا کریں ابھی ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی

بولے کوئی تو تن سے سر اُس کا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو تو قیامت بپا کریں

حضرت عباس کا رُعب داب

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کئے ہوئے تھے نیزہ دار سب باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب

---

[1] زمین پر استراحت فرمانے کے باعث حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا لقب ہوا۔

لیکن ہلا نہ سکتے تھے آنکھ اس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

الٹی جناب قاسم ذیشان نے آستیں   قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبر حسیں
بولے پکڑ کے پیچھے زینب کے مہ جبیں   شبیروں سے کیا نرائی کو لیں گے یہ اہل کیں
کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرت عباس ذی حشم   بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دمبدم
تیغیں جو تولتے تھے ادھر بانئ ستم   کہتے تھے سر نہ ہو گا بڑھایا اگر قدم
لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

حضرت عباس شمشیر بکف آگے بڑھتے ہیں:۔

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیر نر   گرتا تھا کوئی ڈر کے ادھر اور کوئی ادھر
تیغیں جو کھچ گئیں تو ہوا اور شور و شر   گھبرائے اہل بیت شہنشاہ بحر و بر
آغوش میں پھوپھی کی سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

محبت بھرا دل کمزور ہوتا ہے حضرت زینب حضرت عباس کو جنگ سے روکتی ہیں:۔

لڑنے کو تیغ میاں سے کھینچو گے تم اگر   محمل سے گر پڑوں گی زمیں پر میں ننگے سر
عباس تم تو ساقئ کوثر کے ہو پسر   یہ نہر کیا ہے جسکے لئے رنج اس قدر

مر جاؤں گی سفر میں بچھڑوں گی بھائی سے
جنگل مجھے پسند ہے گذری ترائی سے

دریا کو روکتے ہیں اگر بانیٔ ستم جلتی زمیں پہ بچوں کو لیکر رہینگے ہم
غربت زدوں پہ چاہیئے اللہ کا کرم پھر آؤ بس سکینہ کے سر کی تمہیں قسم
ثابت ہُوا کسی کو ہماری ولا نہیں
پانی بھی اب دیں تو ہمیں کچھ گلا نہیں

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہر امام عباس ادھر غضب میں بڑھے سوئے فوج شام
کرسی سی جلد اُٹھ کے پکارے شہہ انام بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

ہر چند اس میں کوئی تمہارا نہیں قصور ناحق فساد کرتے ہیں تم سے یہ بے شعور
خیر امتحاں کا دن بھی کچھ ایسا نہیں ہے دور جانے دو جاہلوں سے یہ تکرار کیا ضرور
ادنیٰ سے بحث ننگ ہے عالی مقام کا
بس خامشی جواب ہے اُن کے کلام کا

ہے گرچہ اُن کی بے ادبی قابل سزا پر تم پسر رحیم کے ہو بخش دو خطا
جنگل ہو یا ترائی ہو ہے ہر جگہ خدا مظلوم کو غریب کو غصّے سے کام کیا
کرتا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے
ہم کو نبی کی روح مطہر کا پاس ہے

حضرت امام حسین حضرتِ عباسؑ کو ضبط کی تلقین فرماتے ہیں:-

آؤ تمہیں قسم ہے جناب امیر کی
بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی
سب سے جدا ہی چاہیئے منزل فقیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہمکو جا
جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا
ہے عمر بے ثبات زمانہ ہے بے وفا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنھوں نے بسائے ہیں
سب اس زمیں میں خاک میں ملنے کو آئے ہیں

پاس ادب

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
چپ ہوگئے قریب جب آئے شہِ اُمم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

حضرت عباس تیغ و سپر کو پھینک کر حضرت امام حسین سے عرض کرتے ہیں :-

اترے گی آکے نہر پہ اب شام کی سپاہ
پانی بھی ہم پہ بند کریں گے یہ روسیاہ
اس دشت میں نہ اور ہے چشمہ کوئی نہ چاہ
سب قافلہ حضور کا ہو جائے گا تباہ
اس فکر میں غلام کا دل آب آب ہے،
پر عین مصلحت ہے جو حکم جناب ہے،

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرتؑ نے یہ کہا   کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
لو اب اُٹھا لو تیغ و سپر تم پہ ہیں فدا   دریا کو تم تو لے چکے اے میرے مہ لقا
وہ شیر ہو کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمہارے سوا ہے ترائی میں

کہنے لگیں یہ زوجۂ عباس خوش بیاں   غصے میں اُن کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
ہر بات میں ہے شیرِ الٰہی کی آن بان   یہ جاں کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسینؑ کے صدقے میں جیتے ہیں

بیانِ ترکِ وطن

کنعانِ[1] محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے   خورشید لقا زہرہ جبینوں کا سفر ہے
چھٹتا ہے وطن گوشہ نشینوں کا سفر ہے   اک دن کا نہیں کوچ مہینوں کا سفر ہے
گلرو چمنِ دہر سے جانے کو چلے ہیں
گھر چھوڑ کے جنگل کے بسانے کو چلے ہیں

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے   جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے   چھٹتا نہیں گھر جان نکل جاتی ہے تن سے

۱؎ "کنعان محمدؐ" کنعان نام ہے اس مقام کا جہاں حضرت یوسف علیہ السلام (جو حسن کے لئے ضرب المثل ہیں) پیدا ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن جو شاعر کے خیال میں کنعان کی طرح مرکز حسن ہے۔

آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح عجب شام　　کرتا ہے سفر قافلۂ راحت و آرام
وہ دشت نوردی وہ غم و صدمۂ آلام　　منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سرانجام
نیند آتی ہے کب لاکھ جو پٹکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

اس فصل میں ہے نہضتِ[۱] فرزندِ پیمبر　　جن روزوں پکھیرو بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
اندھیر ہے خاک اڑتی ہے لو چلتی ہے دن بھر　　جھیلوں سے پرندے بھی نکلتے نہیں باہر
یہ دھوپ میں حدت ہے کہ سب گوشہ نشیں ہیں
سایہ کہاں تپتے بھی درختوں میں نہیں ہیں

برپا ہے مدینے میں تلاطم کئی دن سے　　ہے راحت و آرام و طرب گم کئی دن سے
ہر گھر میں ہے اک شورِ تظلم کئی دن سے　　منہ ڈھانپے ہوئے روتے ہیں مردم کئی دن سے
وہ غم ہے کہ آرام کا جویا نہیں کوئی
راتیں کئی گذری ہیں کہ سویا نہیں کوئی

یثرب کے زن و مرد ہیں سب بے خور و بے آب　　شبیر کی فرقت کی کسی دل کو نہیں تاب
ہمسایہ میں اک غل ہے بکا کرتے ہیں احباب　　غل ہے کہ مدینے میں خوشی اب ہوئی نایاب
اس شاہ میں جو بو ہے شہِ عقدہ کشا کی
اب کون خبر راتوں کو لے گا فقرا کی

۱؎ نہضت بمعنی کوچ۔

خلقت کا ہی مجمع درِ دولت پہ سحر سے
جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے وہ گھر سے
سب کہتے ہیں برسا کے لہو دیدۂ تر سے
چھپ جائیگا اب فاطمہ کا چاند نظر سے

اندھیر ہے گر یہ شہِ والا نہ رہے گا
اب شہر کی گلیوں میں اُجالا نہ رہے گا

در پر کوئی روتا ہے کوئی راہ گذر میں
تاریک ہے دنیا کسی غمگیں کی نظر میں
ہیں جمع محلے کی جو سب بیبیاں گھر میں
اک حشر ہے ناموس شہِ جنّ و بشر میں

سب مل کے بکا کرتے ہیں جب آتا ہے کوئی
یوں روتے ہیں جس طرح کہ مرجاتا ہے کوئی

سب کہتے ہیں زینب سے کہ اے شاہ کی شیدا
کس طرح کے خط آئے یکایک یہ ہُوا کیا
پانی کی کمی، گرمی کے دن خوف کا رستا
وہ دھوپ پہاڑوں کی وہ لو اور وہ صحرا

کیا سوچ کے اس فصل میں شبیر چلے ہیں
بچّوں پہ کرو رحم کہ نازوں کے پلے ہیں

اسی سلسلۂ بیان میں شیر خوار اصغر کی طرف اشارہ کر کے عورتیں سمجھا رہی ہیں ؎

اصغر کہ جدا دکھ ہو قلق ماں کو جدا ہو
گرمی کے سبب دودھ جو گھٹ جائے تو کیا ہو

محبّت پدری و فرزندی

باتیں یہ ابھی تھیں کہ شہِ بحر و بر آئے
دیکھا رخِ ہمشیر کو اور اشک بھر آئے
ماں بیٹی تھی صغرا کو جو چھاتی سے لگائے
روتے ہوئے تشریف شہِ دیں وہیں لائے

بیٹی شہ ذی جاہ کی تعظیم کو اُٹھی
بستر سے عصا تھام کے تسلیم کو اُٹھی

دم چڑھتا ہے بستر سے اٹھاتی ہو اگر سر — بی بی کہو محمل میں چڑھا جائیگا کیونکر
گھر میں تمہیں پانی کی بھڑک رہتی ہے دن بھر — پھر کیا ہو کسی دن جو نہ پانی ہو میسّر
تم جانے کے قابل نہیں یں رہ نہیں سکتا
شب سے ہے وہ تشویش کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

صغرا نے کہا آپ کی الفت کے میں قربان — پھر کس کو ہو گر آپ کو لونڈی کا نہ ہو دھیان
صدقے گئی صحت کا بھی ہو جائیگا سامان — مولا کی توجہ ہے ہر اک درد کا درمان
جس پر نظر لطف مسیح دوسرا ہو
برسوں کا ہو بیمار تو اک دم میں شفا ہو

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت — تپ کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت — پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت
حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقیں ہے
اب تو مرے منہ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

مر جاؤں گی بچھڑی جو مسیح دوسرا سے — صحت مجھے ہو جائیگی حضرت کی دعا سے
کٹ جائیگا اندوہِ سفر فضل خدا سے — بیماری میں جان آئیگی جنگل کی ہوا سے
سب ساتھ ہیں روؤں گی نہ غم کھاؤں گی بابا
لیٹی ہوئی محمل میں چلی جاؤں گی بابا

حضرت امام فرماتے ہیں:-

وہ صعب پہاڑوں کا سفر اور وہ کڑے کوس — دن رات مسافر پہ کبھی دہوپ کبھی اوس
ایک ایک قدم رنج و الم حسرت و افسوس — ہوتا نہیں جز خار کوئی آگے قدم بوس
آرام کہیں راہ میں جانی[1] نہیں ملتا
جنگل ہیں وہ پر ہول کہ پانی نہیں ملتا

ثابت ہوا صغرا پہ کہ اب ہم رہے گھر میں — بس پھر گئی تنہائی کی تصویر نظر میں
اک جوش ہوا آنسوؤں کا دیدۂ تر میں — صدمے سے کھٹک درد کی پیدا ہوئی سر میں
شکل اپنی شب ہجر جو دکھلا گئی اسکو
کانپا یہ تن زار کہ تپ آگئی اس کو

تھرائی ہوئی اُٹھ کے گری شہ کے قدم پر — کی عرض کہ مرجاؤں گی یا سبط پیمبر
تنہائی میں بابا میرا دل بہلے گا کیونکر — سب بیٹیاں ہیں کیا میں نہیں آپکی دختر
بے آپکے اس گھر میں نہ یا شاہ رہوں گی
اچھا میں کنیزوں ہی کے ہمراہ رہوں گی

سب رونے لگے سن کے یہ بیمار کی تقریر — چلائی سکینہ کہ میں صدقے مری ہمشیر
گھبرا کے یہ فرمانے لگے حضرت شبیر — تم بیٹی کو سمجھاؤ کچھ اے بانوئے دلگیر
کم سن ہیں مسافر مجھے تشویش بڑی ہے
دن چڑھتا ہے اور آج کی منزل بھی کڑی ہے

یہ سنتے ہی لب ماں کی تو چھاتی امنڈ آئی — چلائی وہ ناشاد کہ ہے ہے مری جانی[2]
زینب نے کہا گھر سے نکلنا ہے یہ بھائی — مرجانے سے کچھ کم نہیں صغرا کی جدائی

---

[1] اب یہ لفظ بہو بیٹیوں کے لئے نہیں بولا جاتا [2] جانی یعنی بیٹی۔

گھر لٹتا ہے کس طرح قیامت نہ بپا ہو
پہلا ہے یہ غم آگے خدا جانیے کیا ہو

صغرا نے کہا آپ کی باتوں کے میں قربان — تم جان بچالو کہ میں لونڈی ہوں پھوپھی جان
بیٹی ہو علی کی مری مشکل کرو آسان — جیتی رہی صغرا تو نہ بھولے گی یہ احسان
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

کیا خلق میں لوگو کوئی ہوتا نہیں بیمار — ہے کونسی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
زندہ ہوں پہ مردے کی طرح ہو گئی دشوار — کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار
حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اسکا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

یاں ذکر یہ تھا آئے جو روتے ہوئے اکبر — سرخ آنکھیں تھیں اور زرد تھا غم سے رخ انور
چلائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر — اس سینے کے ان ہاتھوں کے قربان یہ خواہر
فریاد ہے بے موت بہن مرتی ہے بھائی
تقدیر ہمیں تجھ سے جدا کرتی ہے بھائی

بھیا مری تنہائی پہ آنسو نہ بہاؤ — وہ دن ہوں کہ پھر خیر سے اس شہر کو آؤ
ہر چند یہ مشکل ہے کہ جیتا ہمیں پاؤ — صدقے گئی پھر آنے کا وعدہ کئے جاؤ
عرصہ ہو تو خط لکھ کے طلب کیجیو بھائی
اب بیاہ میں مجھکو نہ بھلا دیجیو بھائی

رونے کا ادھر غل تھا کہ فضہ یہ پکاری — تیار ہے ناموس محمد کی سواری

دروازے کے نزدیک ہی زینب کی عماری
کیا دیر ہے اب اے اسد اللہ کی پیاری
ہر بار قناتوں کے قریب آتے نہیں عباس
اب جلد سواری ہو یہ فرماتے ہیں عباس

شبیر نے رو کر کہا لو جاتے ہیں صغرا
جلد آتے ہیں یا خود تمہیں بلواتے ہیں صغرا
ہم سب تری تنہائی کا غم کھاتے ہیں صغرا
جان اپنی نہ کھونا تمہیں سمجھاتے ہیں صغرا
قربان پدر آب و غذا ترک نہ کیجیو
بڑھ جائے گا آزار دوا ترک نہ کیجیو

غل تھا شہِ ابرار خدا حافظ و ناصر
رانڈوں کے مددگار خدا حافظ و ناصر
اے خلق کے سردار خدا حافظ و ناصر
محتاجوں کے غمخوار خدا حافظ و ناصر
دکھ فاقوں کے غربت کے الم کس سے کہیں گے
مشکل کوئی اب ہو گی تو ہم کس سے کہیں گے

بلند اخلاق

شہ کہتے تھے اللہ مددگار ہے سب کا
انسان کی کیا آس بھروسا تو ہے رب کا
ساماں ہے کبھی غم کا کبھی عیش و طرب کا
مضطر نہیں فرزند شہنشاہِ عرب کا
مانگو یہ دعا خیر سے وہ وقت بسر ہو
جس روز کہ شبیر کا دنیا سے سفر ہو

یہ کہہ کے بر آمد ہوا وہ خلق کا والی
ناقوں پہ چڑھے سب حرم سید والی
احباب تڑپتے تھے بلکتے تھے موالی
غل تھا کہ محمد کا بھرا گھر ہوا خالی
یوں روتے تھے سب گرد حسین ابن علی کے

جس طرح کہ ماتم تھا جنازے پہ نبی کے

صغرا کو نقاہت سے نہ تھی طاقت رفتار
اٹھی کئی بار اور گری در پہ کئی بار

جس ناقے پہ تھی بانوئے ناشاد دل افگار
اس ناقے کے پاس آکے چلائی وہ بیمار

قربان گئی آخری دیدار دکھا دو
اماں مجھے اصغر کو پھر اک بار دکھا دو

حضرت شہر بانو حضرت صغرا کا یہ کلام سن کر بیتاب ہو جاتی ہیں۔ اور حضرت اصغر کے چہرے کو پردے سے باہر کر دیتی ہیں۔ حضرت صغرا اپنی بیماری کی شدت کا خیال کر کے ایک مایوسانہ انداز سے شیر خوار اصغر کو مخاطب کرتی ہیں ؎

جب آکے پھر اس جھولے کو آباد کرو گے
تم بھی مری گودی کو بہت یاد کرو گے

عباس سے شہ نے کہا اے ثانیٔ حیدر
مر جائے گی اب فاطمہ صغرا مری دختر

چلاؤ سے کہدو کہ بڑھیں اونٹوں کو لے کر
اسواریوں کے ساتھ رہیں قاسم و اکبر

احباب جو روتے ہیں تو غم کھاتے ہیں ہم بھی
سب شہر کے ناکے پہ قسمیں آتے ہیں ہم بھی

یہ سنتے ہی ناقے تو روانہ ہوئے یکبار
غش کھا کے گری خاک پہ صغرا جگر افگار

گھر میں اسے پہنچا کے چلے سید ابرار
غل شہر میں تھا ہائے دو عالم کے مددگار

روتے تھے مجاور جو نواسے کو نبی کے
اک حشر تھا روضے پہ رسول عربی کے

حضرت امام حسینؓ روانہ ہوتے ہیں یارانِ وطن ایک افسردگی کے عالم میں گرد و پیش جمع ہیں اور آپ انہیں اس طرح تلقین فرماتے ہیں :-

دنیا ہے سرائے غم و اندوہ و مصیبت ۔ ہم کیا ہیں پیمبر نے تو پائی نہیں راحت
احباب کا ہے وصل کبھی اور کبھی فرقت ۔ برہم نہ ہوئی ہو کوئی ایسی نہیں صحبت
غم آج تو یہ ہے کہ بچھڑتے ہیں وطن سے
اُٹھ جائیں گے اک روز یونہیں دارِمحن سے

لاکھوں ہیں مسافر کہ نہ پھر آئے سفر سے ۔ جنگل میں عزیزوں کو اجل لے گئی گھر سے
رک جاتی ہے شمشیر کی ضربت تو سپر سے ۔ ساعت وہ اجل کی ہے کہ ٹلتی نہیں سر سے
کتنے ہیں مسافر کہ تہِ خاک نہاں ہیں
قبریں تو ہیں ویرانے میں بستی ہے مکاں ہیں

لطافتِ بیان

فرما کے یہ رخصت ہوئے یارانِ وطن سے ۔ ایام بہاری نے کیا کوچ چمن سے
نکلا دُرِ نایاب نبوت کے عدن سے ۔ طے منزلیں ہوتی تھیں عجب رنج و محن سے
رستے کی وہ سختی وہ سفر رنج و بلا کا
سچ کہتے ہیں سودا ہے کڑا راہ خدا کا

دھوپ کی شدّت

اس دھوپ میں بستانِ محمد کا یہ تھا حال ۔ سونلائے ہوئے رنگ تھے لالے کی طرح لال
چہرے پہ کوئی دھوپ میں روکے ہوئے تھا ڈھال ۔ رکھتا تھا بھگو کر کوئی رخساروں پہ رومال
لو تھی کہ شجر جل گئے تھے دشتِ بلا میں

معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہے آگ ہوا میں

رستے میں سنی جب خبر مسلم و ہانی[ل] منہ ڈھانپ کے رویا اسد اللہ کا جانی

صدمے سے مسافر کا لہو ہوگیا پانی فرماتے تھے افسوس برادر کی جوانی

آج اُن پہ جو گذری وہ ہمارے لئے کل ہے

مسلم کی شہادت نہیں پیغام اجل ہے

اس اثنا میں حضرت مسلم کے بچے سامنے آتے ہیں۔ حضرت امام کا دل بچوں کی یتیمی پر ہل جاتا ہے۔

پاس آکے وہ قدموں پہ جھکانے جو لگے سر شپیر نے چھاتی سے لگایا انہیں اٹھکر

پیشانی کے بوسے لئے منہ رکھ دیا منہ پر بٹھلا لیا مسند پہ انہیں اپنے برابر

فرماتے تھے یہ راحت جاں لخت جگر ہیں

آگے تو بھتیجے تھے یہ اب میرے پسر ہیں

دونوں نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو یہ آن اس لطف پہ بیٹے بھی فدا باپ بھی قربان

ہے فخر غلامی ہمیں اے فاطمہ کی جان کام آئے جو بابا تو خوشا بخت زہے شان

بیٹوں کو نہ کیوں فخر و مباہات کی جا ہو

آزاد وہ بندہ ہے جو آقا پہ فدا ہو

[ل] مسلم و ہانی۔ مسلم سے مراد حضرت امام حسین کے بھائی حضرت مسلم ہیں۔ جن کو حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی روانگی سے پہلے کوفہ روانہ کر دیا تھا۔ ہانی وہ شخص ہے جس کے مکان میں حضرت مسلم پناہ گزین ہوئے تھے۔ اور جو حضرت مسلم کیساتھ ہی شہید کر دیا گیا تھا

حضرت نے کہا بھائی کا غم ہے غم جانکاہ — کیا کیا نہ ستم سہہ کے وہ دنیا سے گیا آہ
درپیش ہمیں بھی کوئی دن میں ہے یہی راہ — اس غم میں تمہیں صبر عنایت کرے اللہ
آفت ہے غم بے پدری دار محن میں
اب تم کو مناسب ہے کہ پھر جاؤ وطن میں

کافی ہے تمہارے لئے مسلم کی شہادت — واللہ میں تم کو بخوشی کرتا ہوں رخصت
لو ماں کو بھی ہمراہ محافے میں بعزت — ہے مصلحت وقت گوارا کرو فرقت
مسلم کی نشانی جو مرے نور نگہ ہو
اب تو مجھے تم اکبر و اصغر کی جگہ ہو

یہ سن کے سر ان دونوں نے پہلے تو جھکائے — پھر جوڑ کے ہاتھوں کو سخن لب پہ وہ لائے
وہ جائیں کہاں اے اسد اللہ کے جائے — جو اپنا وطن چھوڑ کے مرجانے کو آئے
جائیں گے جدھر آپ ادھر جائیں گے مولا
گھر قبر ہے مرجائیں تو گھر جائیں گے مولا

اس وقت میں آقا کی رفاقت سے کنارا — یہ امر غلاموں کو نہ ہوئیگا گوارا
فرمائیے یثرب میں ہے اب کون ہمارا — اک باپ تھا سر پہ سو وہ دنیا سے سدھارا
مشتاق جناں طالب فردوس بریں ہیں
جینے پہ جو مرتے ہیں غلام ان میں نہیں ہیں

منہ کس کو دکھائیں جو پھریں راہ رضا سے — ہم اپنی اجل کے ہیں طلبگار خدا سے
مارا ہے لعینوں نے مسافر کو دغا سے — لیں گے عوض خون پدر اہل جفا سے
مرجائیں گے یا جنگ کو سر کرکے پھریں گے

کوفے کی زمیں خون سے تر کر کے پھریں گے

دو بھائی تو ہمراہ پدر جان گنوائیں
ہم باپ کی مرقد کی زیارت کو نہ جائیں

اس راہ سے پھر جائیں تو منہ کس کو دکھائیں
حسرت ہے کہ جو باپ کا ورثہ ہے وہ پائیں

مر جائیں گے قدموں پہ شہ جن و بشر کے
قبریں بھی جواب ہونگی تو پہلو میں پدر کے

اسطرح بچوں کو تسکین دے کر آپ روانہ ہوتے ہیں ؎

آب دم شمشیر کے مشتاق گلے ہیں
بہتر ہے چلو ہم بھی تو مرنے کو چلے ہیں

جنگل میں گرمی اور لوں سے حضرت امام اور اُن کے رفقا کا یہ عالم تھا ؎

لُو چل رہی تھی رنگ بھی سونلائے ہوئے تھے
جنگل میں گل فاطمہ مرجھائے ہوئے تھے

اثنائے سفر میں فوج یزیدی آپ کے سامنے آتی ہے۔ حُر سردار فوج ہے۔ حضرت عباس غضبناک ہو کر گفتگو کرتے ہیں۔ حضرت امام روکتے ہیں۔ حر بہ لجاجت اپنے جذبۂ عقیدت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں اپنی اور اپنی فوج کی حالت کا اظہار کرتا ہے۔ جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے جاں بلب تھی۔

یہ سنتے ہی بیتاب ہوئے سبط پیمبر
دیکھا رخ عباس کو اشک آنکھوں میں بھر کر

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں سب پیاس سے مضطر
جو ساتھ ہے پانی ابھی منگواؤ برادر

بھیا کمر اب کھولیو پیاس اُن کی بجھا کے
میں کانپ رہا ہوں کہ یہ بندے ہیں خدا کے

حضرت عباس سفرِ دراز قلتِ آب اور بچّوں کی ہمراہی کی طرف اشارہ کرکے روکنا چاہتے ہیں۔

فرمایا مرے سر کی قسم کچھ نہ کہو اب — میری یہی مرضی ہے کہ سیراب ہوں سب
انسان کا انساں سے روا ہونا ہی مطلب — مرجائیں مسلمان یہ گوارا ہے مجھے کب
پانی کے لئے اتنا تردد تمہیں کیا ہے
پیاس ان کی بجھا دو مرے بچوں کا خدا ہے

یہ سنتے ہی سقّوں کو علمدار پکارے — جو پانی ہوئے آؤ وہ سب پاس ہمارے
سقّے تھے جو سرکار کے حاضر ہوئے سارے — مشکیزے بھی ناقوں سے بہ تعجیل اتارے
انصار کٹورے لئے ہاتھوں میں کھڑے تھے
سقّوں نے پکھالوں کے دہن کھول دیئے تھے

سب ہو چکی سیراب جو فوجِ حُرِ دیندار — تب حُر سے یہ فرمانے لگے سیدِ ابرار
اب اپنے ادھر آنے کا احوال کر اظہار — کیا قصد ہے کیا عزم ہے اے مردِ وفادار
نامہ کوئی حاکم کا جو لایا ہو تو کہہ دے
لڑنے کے ارادے سے جو آیا ہو تو کہہ دے

حُر کہتا ہے کہ مجھے حاکم نے آپ کی نگرانی کے لئے بھیجا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سوائے کوفے کے آپ کہیں نہ جاسکیں:۔

حضرت نے کہا پھر تجھے کیا اس میں ہے منظور — کی عرض کہ حاکم کے ہیں ہوں حکم سے مجبور
بس سرخ ہوا غیظ سے شہ کا رخِ پرنور — فرمایا کہ روکے مجھے کس کا ہے یہ مقدور
کیا ہوتا ہے دم بھر میں ذرا ٹوک تو ہمکو

لے ہم ابھی جاتے ہیں بھلا روک تو ہمکو

وہ کون ہے میں جانے نہ جانے کا ہوں مختار
کیا سمجھا ہے قیدی مجھے وہ ظالم غدار
جب تک کہ سلامت ہے یہ ہاتھ اور یہ تلوار
دبنے کا نہیں لختِ دلِ حیدر کرار

بیکس ہوں مسافر ہوں پریشان حزیں ہوں
کچھ حاکمِ کوفہ کا گنہ گار نہیں ہوں

پھرتے ہیں یہیں سے کوئی روکے تو بھلا ہم
اقلیمِ ستمگار سے خود ہے ہمیں اکراہ
کیا اس سے علاقہ جو ہیں سادات کا بدخواہ
جائیں گے جدھر آپ ہمیں لے جائیگا اللہ

کیا شہروں میں کوفے ہی کی آباد زمیں ہے
وسعت ہے بہت ملک خدا تنگ نہیں ہے

حضرت نے قصدِ واپسی کیا تھا کہ حُر سدِ راہ ہوئے۔ حضرت عباس پر غیض وغضب کی حالت طاری ہوتی ہے۔ لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام آپ کو روک کر خود حُر سے ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ چلا جا ورنہ تیری ماں تیرا ماتم کرے گی۔ بالآخر حُر کی لجاجت سے متاثر ہو کر آپ وہیں فروکش ہوتے ہیں۔ نصف شب کے وقت حضرت امام کے اخلاقِ کریمانہ سے متاثر ہو کر حُر درِ دولت پر حاضر ہوتا ہے۔

سوتے تھے ادھر بھی شہِ مظلوم کے نصار
پر جاگتے تھے حضرت عباس خوش اطوار
پھرتے تھے کبھی گردِ خیامِ شہِ ابرار
ڈیوڑھی پہ کبھی آتے تھے باندھے ہوئے ہتھیار

یوں رات بسر ہوتی تھی اس عاشقِ رب کو
جس طرح سے جنگل میں اسد پھرتا ہے شب کو

حضرت عباس سے حر اپنے آنے کی اطلاع کرتا ہے۔

فرمایا کہ یہ آنے کا ہے کون سا ہنگام　　آرام میں ہے فاطمہ زہرا کا دل آرام
کی عرض کہ یا حضرت عباس خوش انجام　　لے دیجئے جا کر در دولت پہ مرا نام
قسمت جو ہے یاور تو شرف پائے گا خادم
آقا نہ بلائیں گے تو پھر جائے گا خادم

تھا پاس ادب خود کہ ہے دربار شہنشاہ　　ہتھیار بھی ہیں باندھ کے آیا نہیں واللہ
اک مرد سپاہی ہوں دغا سے نہیں آگاہ　　کام آئے مرا سر تو ہے نذر شہ ذیجاہ
خاک اس پہ کہ حضرت سے جو دل صاف نہیں ہے
محسن سے بدی شیوۂ اشراف نہیں ہے

حضرت عباس جناب امام کو خبر کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎
فرمایا کہ بے مکر و شر آیا ہے بلا لو
گمراہ تھا اب راہ پر آیا ہے بلا لو

حر آنے والے خطرات سے حضرت امام کو مطلع کرکے رائے دیتا ہے کہ رات ہی رات میں کسی طرف تشریف لے جائیے حضرت بمشکل حر کی تجویز سے اتفاق کرکے روانہ ہوتے ہیں۔

جنگل کی تاریک رات

رونا ہوا رخصت ہوا شہ سے حر دلبند　　راہی ہوئے عجلت میں وہاں سے شہ ابرار
وہ دشت پر آشوب کی وہ دعوت وہ شب تار　　پیڑ کہیں بن میں کہیں پتھر تو کہیں خار
صورت نہ بشر کی نظر آتی تھی بشر کو

معلوم نہ ہوتا تھا کہ جاتے ہیں کدھر کو

حیران و پریشاں تھا وہ سب لشکرِ شاہی
اسواروں پہ آفت تھی پیادوں پہ تباہی
ملتی تھی نہ بستی نظر آتا تھا نہ راہی
گویا شبِ ظلمات تھی جنگل کی سیاہی
کڑیاں[1] شہِ ذیجاہ پہ یوں راہ میں گذریں
جس طرح کہ یوسف پہ شبیں چاہ میں گذریں

یوں دشت میں پھرتے تھے وہ اللہ کے پیارے
جس طرح کریں سیرِ شبِ تار میں تارے
ماندے ہوئے رہوار بھی سب اونٹ بھی سارے
سادات نے وہ دو پہر آفت میں گذارے
گردش میں کٹی رات ولی ابن ولی کو
مقتل پہ ہوئی صبح حسین ابن علی کو

حضرت گھوڑے سے اتر پڑتے ہیں۔ اس مقام کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

کیا وادیٔ دلچسپ ہے، کیا آب و ہوا ہے
رنگینیٔ فردوس ہے جنت کی فضا ہے
سبزہ ہے کہ اک فرش زمرد کا بچھا ہے
گھر چھوڑ کے رہنے کی اگر ہے تو یہ جا ہے
دیکھے جو اسے پھر نہ کرے سیر چمن کی
ہر پھول سے یاں آتی ہے بو باس دلہن کی

بہتر ہے کہ خیمہ بھی یہیں کیجئے برپا
لوں چلتی ہے گرمی ہے بہت یا شہِ والا
دور اُترے تو ہوئیگی بہت پانی کی ایذا
بھر کر نفسِ سرد کہا آپ نے اچھا

[1] کڑیاں بمعنی سختیاں

پھر بولے کہ مانع کوئی غدار نہ ہوئے
وہ کیجیے جس امر میں تکرار نہ ہوئے

آئے ہیں یہاں جس لیے مطلوب ہے وہ کام
دونوں ہیں برابر ہمیں ایذا ہو کہ آرام
خس خانہ میں یا دہوپ میں ہو صبح سے تا شام
ہر طرح بسر کرتے ہیں مردانِ خوش انجام
ایذا رہِ خالق میں ہمیں بھاتی ہے بھائی
یوں بھی غریبوں کی گذر جاتی ہے بھائی

حضرت امام محل کے قریب آتے ہیں۔ حضرت زینب پوچھتی ہیں:۔

آگے کوئی بستی نہیں کیا اے شہ عادل
یہ دشت کسی طرح نہیں رہنے کے قابل
صدقے گئی سینہ میں اچھلتا ہے مرا دل
بچے بھی ہیں سہمے ہوئے کیسی ہے یہ منزل
پہلو سے ذرا ماں کے جو اٹھتی ہے سکینہ
ایک ایک سے ڈر ڈر کے لپٹتی ہے سکینہ

حضرت امام حضرت زینب کو تسکین دیتے ہیں۔ اور اس ارض مقدس کی تعریف فرما کر خیموں کے نصب کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

فراش جو باہر گئے فرش اس میں بچھا کر
کس شان سے داخل ہوئے ناموسِ پیمبر
ہودج سے اترنے لگیں جب دخترِ حیدر
پردے کو سنبھالے ہوئے تھے قاسم و اکبر
رایت لئے عباس فلک جاہ کھڑے تھے
خود اپنی عبا روکے ہوئے شاہ کھڑے تھے

مولا ترے عمامۂ گلگوں کے تصدق
آقا ترے پیراہنِ پرخوں کے تصدق
ان زخموں کے قربان دلِ محزوں کے تصدق
ریتی پہ تڑپتے قدموں کے تصدق

خنجر کے تلے سجدۂ رب کرنے کے صدقے
آقا ترے پانی کے طلب کرنے کے صدقے

✖ حضرت امام حسین معہ اہل بیت کے کربلا میں ورود فرماتے ہیں :-

رنگینیٔ بیان

زہرا کے گلوں سے جو بھرا دشت کا دامن
اُجڑے ہوئے جنگل کی بھی آنکھیں ہوئی روشن
انبارِ خس و خاک بنا غیرتِ گلشن
ہر نخل تھا رشکِ شجرِ وادیٔ ایمن
عکسِ رخِ شبیر کی ضو دور تلک تھی
دریا کی ہر اک لہر میں بجلی کی چمک تھی

اترا جو فرس سے وہ رہ حق کا فدائی
سرسبزیٔ بستانِ ارم دشت نے پائی
وہ نہر وہ اشجار وہ سبزہ وہ ترائی
جنگل بھی ہوا پر تھا[۱] کہ آج اپنی بن آئی
رشک آتا تھا خورشید کو ذرے کی چمک پر
صحرا کے پہاڑوں کی بھی چوٹی تھی فلک پر

حضرت امام حسینؑ جناب عباس سے فرماتے ہیں کہ حر کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ سب کوفی و شامی میرے دشمن ہیں۔ اُن کا ارادہ یہ بھی ہے کہ مجھے پانی نہ دیں :-

جوشِ شجاعت

تھرا کے یہ کہنے لگے عباس دلاور
کیا منہ ہے کسی فوج کا یا سبطِ پیمبر

---

[۱] ہوا پر تھا۔ یعنی فخر کر رہا تھا۔

حق کی جو طرف ہیں انہیں مرنے کا نہیں ڈر اس وقت سمجھ لیں گے جب آئیں گے ستمگر

دشمن ہمیں سر کائیں اب اس جا سے تو جائیں

شیروں کو ہٹائے کوئی دریا سے تو جائیں

فرماکے یہ فراشوں کو عباس پکارے ہاں خیموں کو برپا کرو دریا کے کنارے

سب لوگ تھکے ماندے ہیں لشکر کے ہمارے فراشوں نے بار اونٹوں سے یہ سن کے اتارے

ناگاہ نشان ظلم کے برپا نظر آئے

خیمہ ابھی کھلتا تھا کہ اعدا نظر آئے

فوج مخالف کے لوگوں سے اور حضرت علی اکبر سے دریا کے کنارے اترنے پر کچھ تیز تیز باتیں شروع ہوتی ہیں:-

ہونے لگی اعدا ہیں اور اکبر میں جو تکرار غیظ آگیا برہم ہوئے عباس خوش اطوار

جھپٹے صفت شیر یہ کہتے ہوئے اک بار ہاں ہاں کدھر آتے ہو خبردار خبردار

دم میں نظر آئے گا نہ سر تن پہ کسی کے

شہزادے سے کیجو نہ سخن بے ادبی کے

گھبرا کے ادھر سے شہ والا یہ پکارے ہاں ہاں مرے صفدر مرے عاشق مرے پیارے

تلوار نہ کھینچو ابھی صدقے میں تمہارے راضی ہوں میں اتریں وہی دریا کے کنارے

کچھ غم نہیں جلتی ہوئی ریتی پہ رہیں گے

راحت انہیں ہوئے ہمیں تکلیف سہیں گے

مصوری

آئے جو یہ فرماتے ہوئے شاہ خوش اقبال دیکھا کہ ہے غصے میں بہادر کا عجب حال

رعشہ تنِ پر نور میں خورشید کے تمثال ابرو پہ شکن تیغ بکف غیظ سے رخ لال
بل کھائے ہوئے دوش پہ گیسو وہ پڑے ہیں
بپھرے ہوئے جوں شیر ترائی میں کھڑے ہیں

لُطفِ زبان

غصہ میں کچھ آنکھوں سے نہ دیتا تھا دکھائی حضرت سے کہا آپ ٹھہر جائیے بھائی
کہتے ہیں مرے سامنے لے لیں گے ترائی اس وقت مناسب ہے انہیں چشم نمائی
میں اب انہیں بے جاں سے مارے نہ پھروں گا
بے تیغ کے گھاٹ اُن کو اتارے نہ پھروں گا
بولے یہ برادر سے لپٹ کر شہِ ابرار ہے دھیان کدھر کرتے ہو کن لوگوں سے گفتار
کیا منہ جو ہٹائیں تمہیں دریا سے ستمگار لو تھام لو غصے کو ہمیں کرتے ہو کر پیار
اللہ سزا دے گا انہیں بے ادبی کی
لڑنا ہمیں لازم نہیں امت سے نبی کی

لُو اور دھوپ میں حضرت امام معہ اہل وعیال کے گرم سفر ہیں گرمی کی شدت سے ایک ایک شخص مضمحل و افسردہ ہے ؎
لب خشک تھے گرمی سے ہر اک غنچہ دہن کے
مُرجھا گئے تھے پھول محمدؐ کے چمن کے
سارا دشت تمازت و حرارت سے کرۂ نار بنا ہوا ہے۔ اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :-

ہر دشت حرارت کے سبب تھا کرۂ نار — بے برگ تھیں سب ڈ ابیاں اور جلتے تھے اشجار
ہر کوہ تھا جوں آہن خدا و شرربار — تپتی تھی زمیں پاؤں اُٹھا لیتے تھے رہوار

جو سوتا تھا آغوش بتول عذرا میں
چپکا وہ چلا جاتا تھا اس گرم ہوا میں

مسکن سے پرند اپنے نکلتے تھے نہ باہر — سایہ کیلئے بیٹھتے تھے پتوں میں چھپ کر
اٹھتے تھے چرندے بھی نہ ترائی سے دم بھر — تا شام پڑے رہتے تھے سب جھیلوں کے اندر

تھے شاہ سفر میں ستم قوم شقی سے
اُن روزوں میں چھڑوا دیا گھر آل نبی سے

اثنائے سفر میں حضرت امام کو ایک مسافر کوفے سے آتا ہوا نظر آتا ہے آپ اس سے اپنے بھائی (حضرت مسلم) کی خیریت دریافت فرماتے ہیں۔ حضرت مسلم کے صاحبزادوں کو اس طرح پوچھتے ہیں:۔

زبان و واقعہ نگاری

صحت سے تو ہیں ساتھ جو دو بیٹے ہیں اُسکے — کڑھتے تو نہیں پہلے پہل ماں سے ہیں چھوٹے
کیا کرتے تھے تو نے انہیں دیکھا ہو تو کہدے — ماں روتی ہے اُن کے لئے بھائی ہیں تڑپتے

اس گرمی میں کیا کام تھا بچوں کا سفر میں
بابا سے ہلے تھے نہ رہے اس لئے گھر میں

کم سن تھے بہت اُنکی طرف سے ہے یہ ڈر کا — آگاہ نہیں رنج سفر سے ابھی اصلا
تھا یا وطن میں بھی نہ گھر کا انہیں رستا — اس عمر میں صحرا کوئی دیکھا تھا نہ دریا

ترائی: نشیب کی نمناک زمین

ان منزلوں میں پھول تھے کملا گئے ہونگے
رخ تابش خورشید سے سونلا گئے ہونگے

مسافر سے جب حضرت مسلم اور اُن کے صاحبزادوں کی شہادت کی خبر معلوم ہوتی ہے تو حضرت امام کی حالت یہ ہوتی ہے ؎

رقت کا ہوا جوش لگے کانپنے تھرتھر
سینے میں تڑپنے لگا دل مثل کبوتر

مگر پھر آپ ضبط فرما کر مسافر سے اخفائے واقعہ کی ہدایت فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ مبادا حضرت مسلم کی زوجہ اور اُن کے دو بیٹے (جو اس وقت حضرت امام حسین کے ہمراہ تھے) اچانک اس واقعہ کی تاب نہ لاسکیں فرماتے ہیں کہ۔

مسلم نہیں مارا گیا میں مرگیا واللہ
دو بیٹے بھی زوجہ بھی ہے اس کی مرے ہمراہ
کیا ہوگا وہ جب ہوئیگی اس حال سے آگاہ
دل پر مرے ایک غم کا فلک ٹوٹ پڑا آہ
شرم آتی ہے سمجھانے کا یارا مجھے کب ہے
عورت کے لئے بیوگی کا رنج غضب ہے

رخصت وہ ہؤا آپ پھرے سر کو جھکائے
فرما کے یہ آنکھوں سے بہت اشک بہائے
بیٹھے تھے جہاں پھر وہیں تشریف جو لائے
تر ریش مبارک ہوئی یہ اشک بہائے
رکھ لیتے تھے رومال کبھی دیدۂ نم پر
روتے تھے کبھی سر کو جھکا زانوئے غم پر

میر مونس

جب کیا شاہ نے یثرب سے سرانجام سفر جاں نثاروں کو پہنچنے لگے پیغام سفر
منہ پہ صغرا کے کسی نے نہ لیا نام سفر غش سے چونکی تو کہا شہ سے یہ ہنگام سفر
طَور بربادی کا معلوم مجھے ہوتا ہے
روز اس گھر میں کوئی پچھلے پہر روتا ہے

حضرت صغرا بیمار ہیں۔ اس لئے حضرت امام حسین آپ کو مکان ہی پر چھوڑنا چاہتے ہیں۔ حضرت صغرٰی کہتی ہیں کہ آپ کے چلے جانے کے بعد میری بیماری بڑھ جائے گی۔ میں غم مفارقت کو ضبط نہ کرسکوں گی۔ جناب امام اس طرح تسلی دیتے ہیں ؂

دِن مصیبت کے بہر طور گذر جاتے ہیں
کیا پدر جن کا بچھڑتا ہے وہ مر جاتے ہیں

پھر فرماتے ہیں:۔

بیٹیاں گھر میں اکیلی بھی گذر کرتی ہیں کیا سبھی باپ کے ہمراہ سفر کرتی ہیں
دکھ میں تنہائی میں خالق پہ نظر کرتی ہیں ہر شب ہجر کو طاعت میں بسر کرتی ہیں
اُن کا شیوہ ہے سدا شکر گزاری کرنا
وہیں مرنا وہیں جینا وہیں زاری کرنا

بولی صغرا یہ خبر مجھ کو نہ تھی باباجان اب کھلا مجھ پہ اجل کا ہے یہ سارا ساماں
ساتھ سب جائیں گے اس گھر سے میں تم پر قرباں حکم ہوتا ہے مرے حق میں کہ رہ جاؤ یہاں

کچھ سوا تپ کے نہ ثابت مری تقصیر ہوئی
ہائے بیماری مرے پاؤں کی زنجیر ہوئی

سب کو لے جاؤ گے اور ہم کو نہ لے جاؤ گے — گھر میں پھر آن کے جیتا بھی ہمیں پاؤ گے
تم تو دل اپنا سکینہ سے بھی بہلاؤ گے — ماں جو روئیں گی مری کیا انہیں سمجھاؤ گے

آپ کو سہل ہے ہمراہ نہ ہونا میرا
کیا انہیں یاد نہ آئے گا یہ رونا میرا

شاہ بولے کہ تمہارا انہیں بہتر جانا — یہ سفر وہ ہے کہ ممکن نہیں صحت پانا
ہم نہ بولیں گے جو کہنا نہ ہمارا مانا — جب بلا بھیجیں گے تمکو تو خوشی سے آنا

اپنی دادی کے غم و رنج و محن یاد کرو
جن کی ہم شکل ہو تم اُن کے چلن یاد کرو

منہ کو ایک ایک کے تکنے لگی گھبرا گھبرا — تر ہوا تپ میں پسینے سے گلے کا کرتا
غم سے سینے میں دھڑکنے لگا دل ننھا سا — جوڑ کر کانپتے ہاتھوں کو یہ ہر اک سے کہا

آپ ہی جلتی ہوں میں غم سے نہ ارو لوگو
خیر اللہ نگہبان سدھارو لوگو

حضرت امام رخصت ہو کر دروازے پر گئے، سب لوگ جانے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن حضرت شہر بانو کا یہ عالم ہے۔ ع

پاس سے بیٹی کے ماں کا نہ قدم آگے بڑھا

کہتی تھی سب کی سفر میں تو گذر جائیگی — صاحبو! فاطمہ صغرا مری مرجائیگی

پھر کہتی ہیں :-

غم سے ٹکڑے ہُوا جاتا ہے کلیجہ میرا
آنسو تھمتے ہی نہیں ضبط کیا بہتیرا
نہ تو بہنوں سے نہ کچھ باپ سے کہہ سکتی ہے
کیسی حسرت کی نظر سے مرا منہ تکتی ہے

حضرت امام حسین روانگی کے لئے اہتمام فرما رہے ہیں۔ یکا یک حضرت سکینہ کی زبانی حضرت شہر بانو اور حضرت صغرا کا حال معلوم ہُوا۔ حضرت امام پاس جا کر حضرت صغرا کو سمجھاتے ہیں۔ حضرت صغرا جواب دیتی ہیں۔

جب ہمیں چھوڑ دیا کڑھنے سے پھر کیا حاصل
مر کے یاں ہم بھی پہنچ جائیں گے اول منزل
سچ ہے ہونا نہیں بیمار سفر کے قابل
خالی گھر دیکھ کے اماں کا بھر آتا ہے دل
جانتی ہیں کہ یہ دنیا سے گذر جائے گی
ہم چلے جائیں گے جس وقت تو مر جائے گی

رو کے حضرت نے کہا تم بھی چلو ڈیوڑھی تک
سن کے اس بات پہ رخساروں سے اشک آئے ڈھلک
لے گئے گو دہیں در پر جو شہِ جن و ملک[1]
محملوں کو کبھی تکتی تھی کبھی سوئے فلک
ماں سوار آنکھوں کے آگے تو ادھر ہوتی تھی
شہ کے کاندھے پہ یہ ماتھے کو دھرے روتی تھی

کتنا سمجھاتا تھا اس کو پسرِ شاہِ نجف[2]
آنسو آنکھوں میں بھرے تکتی تھی وہ ماں کی طرف
بانو چلاتی تھی اے شیر الٰہی کے خلف
جان ہو جائیگی بے کس مری بچی کی تلف
ماں ہوں میں دل کو ہے سو طرح کے وسواس مرے
ابھی محمل میں بٹھا دو اسے تم پاس مرے

---

[1] "شہ جن و ملک" سے مراد یہاں امام حسین سے ہے۔ [2] "پسر شاہ نجف" "شیر الٰہی کے خلف" سے مراد حضرت امام حسین ہیں۔

حضرت صغرا جناب امام کا شانہ پکڑ کر رو رہی ہیں :۔

شہ نے بانو سے اشارے سے کہا یہ نہ کہو
بولے ام سلمہ سے اسے تم گود میں لو
کانپتے ہاتھوں کو پھیلا کے وہ بولی رو رو
آؤ قربان گئی باپ کو تکلیف نہ دو

کیوں رلاتی ہو شہِ جن و بشر کو صغرا
چھوڑتی تھی نہ کسی طرح پدر کو صغرا

ہاتھ گردن میں کبھی ڈال کے چلاتی تھی
کبھی شانے کبھی بازو سے لپٹ جاتی تھی
بوجو صغرا کو گل فاطمہ کی بھاتی تھی
اپنا سر باپ کی چھاتی سے نہ سرکاتی تھی

اشتروں پر تو حرم پیٹ کے سر روتے تھے
بانو روتی تھی ادھر شاہ ادھر روتے تھے

سن کے یہ دردسی روئے جو شہنشاہ زمن
پونچھ کر باپ کے آنسو یہ کہا اس نے سخن
بابا روتے ہو عبث روئیں تمہارے دشمن
جو کہو گے سو کرے گی یہ گرفتارِ محن

کچھ کسی کی نہ شکایت نہ گلا ہے بابا
خیر تنہائی میں بے کس کا خدا ہے بابا

کہہ کے یہ جھک گئی دادی کی طرف ہاتھ بڑھا
اس ضعیفہ نے لیا رو رو کے چھاتی سے لگا
شاہ گھوڑے پہ چڑھے قافلہ ڈیوڑھی سے چلا
دیر تک کرتی رہی گریہ و زاری صغرا

در پہ ام سلمہ کرکے فغاں رویا کی
منہ کو ڈھانپے ہوئے عباس کی ماں رویا کی

حضرت مکان سے رخصت ہو کر روضۂ رسالت مآب صلعم پر حاضر ہوئے :۔

رخ کیا شہ نے سوئے قبرِ شہنشاہ انام
بہرِ تسلیم جھکے متصل بابِ سلام[۵]
اذن پڑھ کر جو گئے قبر کے نزدیک امام
عرض کی آیا ہے آج آخری رخصت کو غلام

یہ مکاں ہم سے اب اے شاہِ زمن چھٹتا ہے
آج حضرت کے نواسے سے وطن چھٹتا ہے

وہ نہ تقدیر نے چاہا مجھے جو تھا منظور
جو رضا خالق اکبر کی بشر ہے مجبور
ہاتھ آتا مجھے کس طرح بھلا قرب حضور
مری قسمت میں تو یہ ہے کہ مروں شہر سے دور

دوست چھٹ جائیں مزارِ شہِ خوشخو چھوٹے
قبرِ بھائی کی چھٹے ماں کا بھی پہلو چھوٹے

حضرت روضہ منورہ سے رخصت ہوئے:۔

گرد تھے مرکب شبیر کے سب اہلِ وطن
رخصت ایک ایک سے ہوتے تھے شہنشاہِ زمن
شور تھا ہائے اجڑتا ہے محمد کا چمن
نظر آئیں گے نہ اب شہر میں یہ غنچہ دہن

نوجوانانِ علی ہائے غضب جاتے ہیں
جن سے رونق تھی مدینے کی وہ سب جاتے ہیں

ساتھ ان سب کے چلے وا اس سے شہ کون مکاں
بے کسی چہرے پہ تھی آنکھوں سے آنسو تھے رواں
لوگ سر پیٹ کر اس دم ہوئے یوں گریہ کناں
پیچھے تابوت کے جس طرح سے ہو شور و فغاں

غل تھا اے سید ذی جاہ خدا کو سونپا
اے مدینے کے شہنشاہ خدا کو سونپا

---

[۵] "باب السلام" روضۂ نبوی کے قریب ایک دروازے کا نام۔

غول رانڈوں کے یہ چلاتے تھے کھولے ہوئے سر
اے غریبوں کے مددگار یتیموں کے پدر
آپ تو کرتے ہیں یثرب سے مہینوں کا سفر
کون ہم رانڈوں کی لیوے گا مصیبت میں خبر
کون بن باپ کے بچوں پہ ترس کھائے گا
کون چھپ چھپ کے طعام اب ہمیں پہنچائے گا

حضرت امام مدینہ منورہ سے اس طرح رخصت ہو رہے ہیں ؎

سب کو سمجھاتے ہوئے شاہ چلے جاتے تھے
لوگ روتے ہوئے ہمراہ چلے جاتے تھے

مذمتِ دُنیا

دنیائے دنی دشمنِ درویش وغنی ہے
ہر بندۂ اللہ کی یہاں دل شکنی ہے
گہ کاہشِ جان گاہ غم بے وطنی ہے
اس نخل کا جو پھل ہے وہ برچھی کی انی ہے
ہے داغِ جگر جس پہ ہمیں گل کا گماں تھا
سنبل جسے سمجھے تھے وہ آہوں کا دھواں تھا

رہتا نہیں رنگ اس چمنِ دہر کا یکساں
گہ دخلِ خزاں ہے تو کبھی فصلِ بہاراں
غنچہ کبھی خنداں ہے کبھی سر بگریباں
بلبل ہے کبھی چہچہہ زن اور کبھی نالاں
یکساں نہ کبھی طرۂ سنبل نظر آیا
اک رنگ پہ دو دن نہ کوئی گل نظر آیا

ناقص کو ترقی ہے تو کامل کو تنزل
کانٹوں کی بن آئی ہے خلش میں ہے رگ گل
ہر کاہ ہے بل پر کہ میں ہوں گیسوئے سنبل
ہے زاغ کو دعوائے خوش الحانی بلبل

سر کھینچا ہی شعلے نے کہ گلزار جناں ہوں
نازاں ہے بگولہ کہ میں ہی سرو رواں ہوں

دنیا میں کسی روح کو راحت سے نہ دیکھا ‏ ہر گز کوئی دل صاف کدورت سے نہ دیکھا
خالی کوئی گھر رنج و مصیبت سے نہ دیکھا ‏ فارغ کسی انساں کو اذیت سے نہ دیکھا

دنیا نظر اہل بصیرت سے گری ہے
ادنیٰ سے موافق ہے تو اعلیٰ سے پھری ہے

دانا کے لئے درد ہے ناداں کو ہی درماں ‏ ہے زہر کسی جا تو کہیں ہے شکرستاں
گلزار کہیں ہے تو کہیں خار مغیلاں ‏ کافر کے لئے خلد ہے مومن کو ہے زنداں

اس زال جفا جو نے کسی سے نہ وفا کی
دشمن ہے ہمیشہ سے یہ خاصان خدا کی

اس تمہید کے بعد حضرت امام حسین کے مصائب کا ذکر ہوتا ہے۔ مدینہ طیبہ سے روانگی کے وقت حضرت امام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں سے جب رخصت ہو کر بڑھتے ہیں۔ تو غریب بیوائیں فریاد کرتی ہیں۔

اک سمت کو بیواؤں میں تھی گریہ وزاری ‏ بعد آپ کے اب کون خبر لے گا ہماری
اب دیکھئے کب پھرتی ہے حضرت کی سواری ‏ اللہ نگہبان ترا اے عاشق باری

اب کس کو پڑی ہے کہ وہ پہنچائے گا کھانا
اب کون غریبوں کیلئے لائے گا کھانا

اس کے بعد حضرت صغریٰ سے تسکین و دل دہی کی باتیں کر کے

رخصت ہوتے ہیں:۔

رخصت ہوئے بیٹی سے یہ فرما کے بہ رقت
مڑ مڑ کے مگر دیکھتے جاتے تھے بحسرت
ہر گام پہ رو رو کے یہ فرماتے تھے حضرت
اے شہر مدینہ مری تجھ سے بھی ہے رخصت
ویرانیٔ یثرب[1] کا الم لے کے چلا ہوں
برباد تو ہوتا ہے یہ غم لے کے چلا ہوں

مدینہ سے روانگی کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچتے ہیں:۔

یوں کوچ کیا شاہِ غریباں نے وطن سے
جس طرح بہار آ کے نکل جائے چمن سے

وہ بے وطنی گھر کی تباہی کا وہ افسوس
غربت تھی عیاں گرد مصیبت تھی قدمبوس
دن کی تو وہ دھوپ اور وہ راتوں کی غضب اوس
رستہ وہ پہاڑوں کا وہ جنگل کے کڑے کوس[2]
دنیا کی بلندی کہیں پستی نظر آئی
صحرا کہیں دیکھا کہیں بستی نظر آئی

جادے کا نشاں راہ میں تھا اور نہ سبیلیں
مسدود تھی ہر سمت سے پانی کی سبیلیں
پیاسوں کی یہ تھی پیاس کہ دریا ہو تو پی لیں
بے آب تھے جنگل کے کنوئیں خشک تھی جھیلیں
بچوں کو یہ تھی پیاس کہ بیتاب ہوئے تھے
شبنم کے بھی قطرے دُرِ نایاب ہوئے تھے

وہ ریت کے تودے وہ خس و خاک کے انبار
مسکن کہیں شیروں کے تو اژدر کے کہیں غار

---

[1] "یثرب" مدینہ طیبہ کا قدیم نام [2] "کڑے کوس" لمبے کوس۔

رستہ کہیں بیہڑ[1] نظر آیا کہیں ہموار
ہلتے تھے درندوں کی صداؤں سے دل زار
کس درد سے مرغانِ ہوا روتے تھے شہ پر
اُٹھ اُٹھ بگولے بھی فدا ہوتے تھے شہ پر

مقتل پہ پہنچنے کی جو اک دن کی رہی راہ
بس فوجِ عدو دور سے پیدا ہوئی ناگاہ
جس وقت کہ آئی خبرِ لشکرِ گمراہ
عباس نے اونچا کیا بڑھ کر علمِ شاہ
تھرا کے جری نے رخِ شبیر کو دیکھا
اُس فوج کو دیکھا کبھی شمشیر کو دیکھا

حر کی فوج نمودار ہوتی ہے۔ ہمراہیانِ حر بھی بشدتِ تشنگی سے بیتاب ہیں۔ گرمی اور پیاس کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:-

جلتے تھے حرارت کے سبب دل بھی جگر بھی
تھی پیاس کی تکلیف بھی ایذائے سفر بھی
باقی نہ رہا تن میں رطوبت کا اثر بھی
حیوان بھی پانی کو ترستے تھے بشر بھی
آہو کی طرح دھوپ میں کالے ہوئے توسن
مضطر تھے زبانوں کو نکالے ہوئے توسن

حضرت نے جو پیاسا صفِ کفار[2] کو دیکھا
اللہ رے کرم دل شہِ والا کا بھر آیا
عباس کو پاس اپنے بلا کر یہ سنایا
پانی انہیں جتنا ہو پلا دو مرے شیدا

---

۱ بیہڑ بمعنی ناہموار ۲ "صفِ کفار" کو "نبی کی امت" بھی کہتے ہیں۔ اس لئے غالباً یہاں کفار اصطلاحِ شرعی نہیں بلکہ شاید اس کے لغوی معنی "انکار کرنیوالے" کے لئے ہیں یعنی حضرت امام حسین سے انکار کرنے والے لوگ۔

آ گئے مرے یاں دل شکنی ہو نہ کسی کی
کر دو انہیں سیراب یہ امت ہیں نبیؐ کی

عباس نے کی عرض کہ اے قبلۂ[1] ایماں — پانی جو نہ ہوگا تو ہلاکت کا ہے ساماں
مرجائیں گے یہ پھول سے بچے بھی اُسی آں — اس دشت میں پانی نہ ملے گا کسی عنواں

ڈھونڈھیں گے جو سب مل کے تو دریا نہ ملیگا
جز دیدۂ تراب کوئی چشمہ نہ ملے گا

حضرت امام حضرت عباس کو جواب دیتے ہیں۔ کہ خدا مالک ہے ع

کیا غم ہے جو پانی ہمیں ہوگا نہ میسر

مگر اس وقت تو ع

پیاسا انہیں دیکھوں یہ گوارا نہیں مجھکو

یہ سنتے ہی سقّوں کو بہشتی نے بلایا — لو پیاسو پیو پانی یہ پیاسوں کو سنایا
حضرت کا جو دریائے کرم جوش پہ آیا — پانی انہیں خود مالکِ کوثر نے پلایا

مشکیں لئے سقے چلے آتے تھے قفا سے
اک شور تھا لشکر میں کٹوروں کی صدا سے

جان آگئی یوں تشنہ دہانوں کے بدن میں — جس طرح کہ ابر آکے برس جائے چمن میں
کیا رحم و کرم تھا دلِ سلطانِ زمن[2] میں — پانی دیا گھوڑوں کو بھی بھر بھر کے لگن میں

قربان ترحم پہ شہِ تشنہ گلو[2] کے

---

[1] "قبلۂ ایماں" یہاں حضرت امام حسین کو کہا گیا ہے۔ [2] "سلطان زمن" "شہ تشنہ گلو" سے مراد حضرت امام حسین ہیں:۔

سیراب کیا اُن کو جو پیاسے تھے لہو کے

ناگاہ سیاہی سرِ میدان نظر آئی خورشید چھپا شامِ غریباں نظر آئی
تاثیرِ غمِ سرورِ ذی شان نظر آئی شبنم سے شبِ تار بھی گریاں نظر آئی
گھیرا تھا جو ظلمت نے مہِ برجِ کرم[۵۱] کو
پوشاک سیہ چرخ سے اتری تھی حرم کو

پہنچے جو کمر تک شبِ دیجور کے گیسو[۵۲] اور سو گئے فتنہ کی طرح سب وہ سیہ رو
اٹھنے لگے بس وں اس سے خیامِ شہِ خوشخو مقتل کی تمنا میں چلے سیّدِ حق جو
رونے کی صدا ہر دلِ رنجور سے آئی
شبیر کے لینے کو اجل دور سے آئی

پُرہول وہ صحرا وہ بیاباں کی سیاہی ہر شے تھی سیہ ماہ سے تا مسکنِ ماہی[۵۳]
دیتی تھی وہ شب غربتِ سرور[۵۴] پہ گواہی ظلمت میں نظر بھی اگر آئی تو تباہی
حلقے میں لئے تھے رفقا سبطِ نبیؐ کو
صورت نہ کسی کی نظر آتی تھی کسی کو

---

۵۱ "مہ برج کرم" سے مراد حضرت امام حسین ہیں۔ ۵۲ "پہنچے جو کمر تک شب دیجور کے گیسو" یعنی جب آدھی رات ہو گئی ۵۳ "ماہی" سے مراد وہی ماہی ہے جس پر عام عقیدے کے موافق گاؤ زمین کھڑی ہوئی ہے۔ یہ گاؤ زمین کہا جاتا ہے کہ اپنے سینگ پر زمین کے طبقوں کو لئے کھڑی ہے۔ ۵۴ "سرورؑ" بمعنی سردار یہاں مراد حضرت امام حسین ہیں۔

حضرت تو سکندر تھے وہ شب تھی شبِ ظلمات
خالِ رخِ زنگی کو بھی اُس شب نے کیا مات
ایسی کبھی دشمن کو دکھائے نہ خدا رات
صدمے پہ جو صدمے تھے تو آفات پہ آفات
زہرا کا قمر دشت کی ظلمت میں گھرا تھا
بے نور تھے تارے بھی یہ اندھیر نیا تھا

جنگل سے جو آتی تھی صدائیں وہ ڈرانی[1]
شیروں کے بھی دل خوف سے ہو جاتے تھے پانی
تھے غولِ بیابانِ[2] بلا دشمنِ جانی
شعلوں کی لپک تھی کہ جہنم کی نشانی
آندھی میں اذاں دینے کی ہر سمت صدا تھی
اُٹھ جاتے تھے اونٹوں کے قدم بھی تو ہوا تھی

٭

حضرت امام حسین اس سرزمین میں داخل ہوتے ہیں جس سرزمین کی موت میں لذتِ حیات ہے :۔

اکبر نے عرض کی کہ سفر ہو چکا تمام
گر حکم ہو تو اب ہو اترنے کا انتظام
عباس نے کہا کہ لبِ نہر ہوں خیام
بیٹے سے تب یہ کہنے لگے شاہِ خاص و عام
تدبیرِ راحتِ حرمِ مصطفٰے کرو
اچھا تو ہے فرات پہ خیمے بپا کرو

فرماتے تھے یہ شاہ کہ بدلی سی چھا گئی
اک غل ہوا کہ فوج لعینوں کی آ گئی
ٹاپوں سے مرکبوں کے زمیں تھرتھرا گئی
باجوں کی تا بہ گنبدِ گردوں صدا گئی

[1] ڈرانی یعنی ڈراونی خوفناک۔ [2] "غول بیاباں" کہا جاتا ہے کہ مبدانوں میں کچھ خبیث روحیں ہوتی ہیں جو روشنی دکھا دکھا کر مسافروں کو بھٹکایا کرتی ہیں۔

فرمایا شاہ دیں نے کہ لائے کوئی خبر
آمد ہے کس کی اور یہ کیسا ہے شور و شر

قاصد دوڑا ہوا جاتا ہے اور واپس آ کر عرض کرتا ہے۔ کہ حضور سے

دیکھا ہے جو کہا نہیں جاتا غلام سے
آیا ہے ابنِ سعد بڑی دھوم دھام سے

ابن سعد کے لشکریوں نے حضرت امام کے ہمراہیوں سے کہا کہ خیمہ اس مقام سے علیحدہ نصب کرو۔ اس پر حضرت عباس کو طیش آ جاتا ہے۔ حضرت امام حضرت عباس کی تیز مزاجی دیکھ کر نصیحت فرماتے ہیں ؎

کرتا ہے وہ بدوں سے بھی نیکی جو نیک ہے
ریتی ہو یا ترائی ہو سب ہم کو ایک ہے

حضرت امام حسین کی عبادت گزاری کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

بیٹھے تھے جانماز پہ شاہنشہِ اُمم　　تسبیح دست پاک میں اشکوں سے چشم نم
سوکھے ہوئے لبوں پہ دعا تھی یہ دمبدم　　یارب ڈگیں نہ[1] راہِ رضا سے مرے قدم

مسکین و دردمند و حزین و غریب ہوں
بیکس ہوں تشنہ کام ہوں آفت نصیب ہوں

وہ ظلم ہو رہا ہے کہ جس کی نہیں ہے حد　　تیرے سوا کریگا اس آفت کو کون رد

---

[1] "قدم نہ ڈگیں" یعنی ثابت قدم رہوں۔

پانی کی جستجو میں بہت کر چکا ہیں کد	کر رہبر روحِ ساقیٔ کوثر مری مدد

سب مضطرب ہیں ہوش کسی کے بجا نہیں

بچوں کو تین روز سے پانی ملا نہیں

✻

میر نفیس

امام حسین کی روانگی

دشتِ غربت میں وطن سے شہِ دیں جاتے ہیں	ساتھ سب غنچہ دہن ماہ جبیں جاتے ہیں

غل ہے کنعانِ امامت کے حسین جاتے ہیں	خاک ہونے کیلئے عرش نشیں جاتے ہیں

گلشنِ بادشہِ قلعہ شکن لٹتا ہے

جس میں جنت کی فضا تھی وہ چمن لٹتا ہے

ہائے اب آنکھوں سے چھپ جائیگا خورشید حجاز	کون اب ہم کو پڑھائے گا جماعت کی نماز

یاں اقامت نہ کریں گے جو شہِ بندہ نواز	نہ سنیں گے علی اکبر کی اذان کی آواز

مقتدا[1] کے لئے سب پیٹ کے سر روئیں گے

والیٔ عصر[1] چلا شام و سحر روئیں گے

روانگی کا یاس انگیز منظر

خاک اڑتی ہے دمِ صبح سے ڈیوڑھی ہے اداس	چار جانب ہے بوفورِ الم و حسرت و یاس

جو روتے ہیں تو بچوں کے بھی ہے دلکو ہراس	علی اکبر متردد ہیں مشوش عباس

---

[1] مقتدا اور والیٔ عصر سے مراد حضرت امام حسین ہیں۔

دیکھ کر شاہ کو اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں
باہر آتے ہیں کبھی گھر میں کبھی جاتے ہیں

ہے محل رونے کا ایسا ہو جو گھر بے رونق — سینۂ سقف ہوا جاتا ہے اندوہ سے شق
شہ نشیں خاک نشیں حجروں میں اسباب قلق — صاف دالان ہے ماتم کے مرقع کا ورق
غم سے محراب ہے خم قبلۂ عالم کے لئے
ہر ستوں خاک پہ استادہ ہے ماتم کیلئے

محلہ کی بیبیاں جو رخصت کرنے کو آئی ہیں کہتی ہیں :-

یہ تب و تاب یہ دھوپ اور پہاڑوں کی یہ راہ — کہیں سایہ نہ کہیں نخل نہ بستی کوئی آہ
نہ تو چشمہ نہ کہیں چاہ نہ سبزہ نہ گیاہ — چمنستانِ محمدؐ[1] کا نگہباں اللہ
ہے غضب شہر کو ویران کئے جاتے ہیں
شیر خواروں کو بھی ہمراہ لئے جاتے ہیں

ننھے بچوں سے بھلا اُٹھے گی ایذائے سفر — فصل آرام کی ہے کھیل کے ہیں یہ خوگر
سائے سے دھوپ میں آتے نہیں اک دم باہر — ٹھنڈے پانی کی طلب رہتی ہے اُنکو دن بھر
گرم ہوئے گی ہوا دھوپ میں محمل ہونگے
پیاس کے یہ گل تازہ متحمل ہونگے؟

حضرتِ صغریٰ کا ہمراہ جانے کیلئے اصرار

ماں کا منہ دیکھ کے کہتی ہے کہ میں تم پہ فدا — گھر میں باہر سے ابھی کیا نہیں آئے بابا
کوچ میں سید ابرار[2] کے اب دیر ہے کیا — دیکھ کر تم مجھے کس واسطے کرتی ہو بکا

[1] چمنستانِ محمدؐ سے مراد خاندانِ نبوت ہے [2] سیدِ ابرارؑ سے مراد حضرت امام حسین ہیں

اب تو صحت سے ہوں منہ اشکوں سے دہونا کیسا
میں تو ساتھ آپ کے چلتی ہوں یہ رونا کیسا

میرا اسباب ابھی کیا نہیں بھیجا باہر   ساتھ لے لیجئے ٹھنڈائی کی دوائیں مادر
نہ کراہوں گی نہ اب روؤں گی میں خستہ جگر   ہے یقیں صحت کامل مجھے بخشے یہ سفر
اب تو طاقت بھی ہے کچھ فضلِ خدا سے مجھ میں
جان آجائے گی جنگل کی ہوا سے مجھ میں

لڑکیوں کی سعادتمندی

سب کی راحت کا رہے گا مجھے رستے میں خیال   کھانا کھلواؤں گی بابا کو ہلا کر رومال
جس جگہ راہ میں اتریں گے شہِ نیک خصال   پاؤں ہاتھوں سے دھلاؤں گی خوشی ہو کے کمال
یہ سفر خوب ہے تحصیلِ سعادت کیلئے
بیٹیاں ہوتی ہیں ماں باپ کی خدمت کیلئے

امام حسین کے انکار پر حضرت صغریٰ کے طنزیہ شکوے :-

میں تو سمجھی تھی کہ لے جاؤ گے مجھ کو ہمراہ   اب کھلا مجھ پہ کہ حضرت کو ہماری نہیں چاہ
خوب تدبیر مرے واسطے کی آپ نے آہ   نہ رہی ہوں نہ رہوں گی میں اکیلی یا شاہ
سخت دل چاہئے فرقت کا الم سہنے کو
دے چلے ہو مجھے ڈھنڈھار[1] مکاں رہنے کو

کہہ کے یہ کرتے کے دامن کو رکھا آنکھوں پہ   ہچکیاں لے لے کے رونے لگی وہ خستہ جگر
منہ سے دامن کو ہٹا کر یہ پکارے سرور   ٹکڑے دل ہوتا ہی بس روؤ نہ اے نورِ نظر

[1] بڑا سا سونا مکان

وہ تو ہوگا جو مقدر تمہیں دکھلائے گا
اس طرح روؤگی بی بی تو غش آ جائے گا

اب تب و تاب ہیں کیونکر تمہیں لیجاؤں بھلا
ہر قدم خوف و خطر دھوپ کڑی گرم ہوا
اور بڑھ جائے مرض کچھ تو کروں راہ میں کیا
منع ہے حق میں مریضوں کے حرج اے صغرا
ساتھ لیتے جو توانا تمہیں پاتے بی بی
ایسے بیمار سفر میں نہیں جاتے بی بی

حضرت صغریٰ عرض کرتی ہیں :-

ہاتھ میں جوڑتی ہوں اب مرے اچھے بابا
پاؤں پر گرتی ہوں میں مجھ کو نہ چھوڑو تنہا
رحم کیجے مری منت پہ یہ لونڈی ہو فدا
میری بیماری کا حضرت کو اگر ہے کھٹکا
اچھی میں ہو لوں تو ہو یاں سے روانہ بابا
یا میں دنیا سے گذر جاؤں تو جانا بابا

بولے پیشانی پہ منہ رکھ کے امام دو جہاں
کیا خفا ہو گئیں بابا سے تم اے راحت جاں
جا کے کوفے میں اگر موت نے دی ہم کو اماں
وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم کو بلا لیں گے وہاں
دیر میں پہنچے سواری تو نہ گھبرانا تم
ساتھ نانی کے مری جان چلی آنا تم

امام حسین اپنی صاحبزادی کو تسلی آمیز وعدہ دے کر فرماتے ہیں - کہ ہم تم سے جان بوجھ کر خود بخود جدا نہیں ہو رہے ہیں - بلکہ ؎

آپ سے کیا یہ پدر داغ دیئے جاتا ہے
کوئی کھینچے ہوئے یثرب سے لئے جاتا ہے

حضرت صغریٰ پیارے بھائی علی اصغر کو پیار کر کے جُدا ہوتی ہیں۔ کہ پھر دفعتہً خواہرانہ محبت کے جذبات سینے میں موج زن ہوتے ہیں۔ بے اختیار ہو کر پھر اُسے لپٹا لیتی ہیں اور کہتی ہیں:۔

دل پہ غم اس کی جدائی کا نہ آنے دونگی
میں تو بھیّا علی اصغر کو نہ جانے دونگی

حضرت امام حسین حضرت صغریٰ کی گود سے علی اصغر کو یہ کہہ کر لیتے ہیں ؎

اس کا دل کڑھتا ہے اشکوں سے جو منہ دھوتی ہو
کیا یہ اب گھر میں نہ آئے گا جو یوں روتی ہو

چڑھ کے ناقوں پہ روانہ ہوئے سب اہلِ حرم
دے کے اصغر کو گری خاک پہ وہ کشتۂ غم
بیٹھتی گھر میں گئی فاطمہ[۱] بادیدۂ نم
جب نہاں ہو گئے آنکھوں سے شہنشاہِ امم

غم سے افسردہ ادھر شاہِ زمن جاتے ہیں
ساتھ روتے ہوئے سب اہلِ وطن جاتے ہیں

سفر کی راہ سنگلاخ

تھی بلندی کسی جا اور کہیں پستی کہیں غار
وہ صعوباتِ سفر اور وہ رستے کا غبار
کہیں میداں کفِ دست اور کسی جا کہسار
کہیں ٹھبیڑ[۲] کہیں پتھر کہیں ریتل کہیں خار

دھوپ سے راہ میں راحت نہ ذرا پاتے تھے
محملوں میں حرمِ پاک گھٹے جاتے تھے

۱؎ مراد حضرت صغریٰ سے ہے ۲؎ ٹھبیڑ بمعنی ناہموار راہ۔

ثعلبیہ[۱] سے بڑھے جب کہ شہِ جن و بشر — تھا مشوش بہت اُس روز علی کا دلبر
آئی جو مسلم بے کس کی شہادت کی خبر — غم سے دِل ہل گیا تھرّا گئی سینے میں جگر
ضبط مطلق نہ ہوا اشکوں سے منہ دھونے لگے
دیکھ کر حضرتِ عباس کا منہ رونے لگے

اسی ماتم اسی غم میں ہوئی وہ شب جو اخیر — صبح کو واں سے روانہ ہوئے شاہِ دلگیر[۲]
کئی دن تک رہے رستے میں پریشاں شبیر — جس کے مشتاق تھے آخر وہیں لائی تقدیر
مسکرا کر کہا مظلوم کا مقتل ہے یہی
جس کی نانا نے خبر دی تھی وہ جنگل ہے یہی

روک لو گھوڑوں کی باگیں کہ سفر ختم ہوا — آئے اب منزلِ مقصود پہ ہم شکرِ خدا
کھِل گیا غنچۂ دل دیکھتے ہی یاں کی فضا — واہ کیا سبزہ ہے کیا نہر ہے کیا سرد ہوا
دل خنک ہوتا ہے جس سمت نظر جاتی ہے
یاں کے ہر پھول سے فردوس کی بو آتی ہے

مگر حضرت زینب یہ معلوم کر کے کہ دشتِ کربلا جس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، یہی ہے بہت افسردہ ہوتی ہیں اور امام حسین سے باصرار یہ کہتی ہیں کہ اس دشت میں قیام مناسب نہیں ہے۔

بخدا ہے یہ جگہ خوف کی یا شاہِ امم — بچے ڈرتے ہیں درندوں کی صدا سے ہر دم
موجیں اس نہر کی تیزی سے ہیں شمشیرِ دودم — دل بھر آتا ہے چھایا ہے عجب رنج و الم

[۱] ثعلبیہ کربلا کے نزدیک ایک مقام کا نام ہے [۲] شاہِ دلگیر یعنی حضرت امام حسین۔

دم اُلجھتا ہے پریشان ہوا آتی ہے

جس طرف سنتی ہوں رونے کی صدا آتی ہے

غنیم کی طرف سے ایک فوج آتی ہے جو حضرت امام حسین کے ہمراہیوں سے نہر کے قریب ٹھیرنے پر مزاحمت کرتی ہے۔

سن کے یہ ہونٹ چبانے لگے عباس اُدہر　　جھوم کر دوش سے لی ہاتھ میں غازی نے سپر

شیر نے منہ جو ترائی سے نکالا باہر　　گر پڑے ڈر کے لعیں ہل گئے سینوں میں جگر

دشت کانپا تو مکاں امن کا نایاب ہوا

موجیں ہٹنے لگیں دریا کا بھی دل آب ہوا

حضرت علی اکبر لشکرِ غنیم کو ڈانٹ کر فرماتے ہیں کہ تم ہمیں نہر کی ترائی سے ہٹا نہیں سکتے ہم وہ ہیں۔ کہ ؎

غیظ میں آئیں تو اس طرح الٹ دیں افلاک

جس طرح پھینکدے دامن سے جھٹک کر کوئی خاک

امام حسین نے حضرت عباس کو روح محمدؐ کی قسم دے کر لشکرِ غنیم سے قتل و قتال سے روکا۔ پاسِ ادب سے حضرت عباس لوٹ تو آئے۔ مگر جذبۂ جلادت سے دانت پیستے ہوئے مڑ مڑ کر مخالفین کو دیکھتے ہیں:—

تھا زبس پاسِ ادب بول نہ کچھ سکتے تھے

شیر سے فوج کو پھر پھر کے مگر تکتے تھے

ملہ غازی سے مراد یہاں حضرت عباس ہیں۔

سلسلۂ واقعات :-
حضرت مسلم اور آپ کے صاحبزادوں کی شہادت کی خبر چونکہ حضرت امام حسین کو دوران سفر میں ملی تھی۔ اس لئے روداد سفر کے بعد آپ کے واقعات شہادت درج کئے جاتے ہیں۔

شہادتِ حضرت مُسلم

میر ضمیر

واقعہ نگاری

جب کیا کوفیوں نے شہ کو طلب کوفے میں — تھا یہ مضمونِ خطوط، آئیے اب کوفے میں
بلکہ مشتاق زیارت کے ہیں سب کوفے میں — بھیجا مسلم کو غرض شاہ نے تب کوفے میں

خبرِ آمدِ مسلم جونہی معلوم ہوئی
کو بکو خانہ بخانہ عجب اک دھوم ہوئی

جب بجا لائے شروطِ ادب و استقبال — داخل شہر ہوئے شادی سے ہو مالا مال
آمدِ سبطِ محمد کا لگے پوچھنے حال — کوفیوں سے کہا مسلم نے بہ تمکین کمال

حال سے یاں کے جو واقف شہِ دیں ہوویں گے
دیکھنا ماہ محرم میں یہیں ہوویں گے

حضرت مسلم کے ہاتھ پر انبوہِ کثیر نے بیعت کی۔ یہ خبر حاکم شام تک پہنچی

وہاں سے ابنِ زیاد بھیجا گیا :۔

صبح مسجد میں گیا ابنِ زیادِ غدار   بیٹھ منبر پہ سرِ عام یہی کی گفتار
جو کوئی بیعتِ مسلم کا کرے گا اقرار   حکم حاکم سے ہیں ضبط اسکا کرونگا گھر بار
کی ہو جس جس نے کہ بیعت سو لکھو نام اسکا
دیکھو دو روز میں کیا ہوتا ہے انجام اسکا

اہلِ کوفہ خوف زدہ ہو کر حضرت مسلم کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ حضرت مسلم ہانی کے مکان میں پوشیدہ ہوئے۔

مومنیں جاتے تھے چھپ چھپ کے وہاں پہ بہم   مسلم اخبار کی لے لیتے تھی اُن سب سے قسم
عرض کرتے تھے یہ سب چوم کے حضرت کے قدم   دست بردار ہیں جان و زن و فرزند سے ہم
ٹکڑے ٹکڑے ہمیں اس رہ میں جو سو بار کریں
ہم غلامی سے نہ شبیرؑ کی انکار کریں

ہانی کے مکان پر ایک شخص جو حُبِ اہلِ بیت رکھتا تھا۔ مہمان تھا، ابن زیاد سے باہمی رسم تھی۔ ایک دن مہمانِ مذکور نے حضرت مسلم کو اطلاع دی کہ ابنِ زیاد آیا ہوا ہے۔ آپ اسے قتل کر دیں۔ آپ جواب دیتے ہیں سے

حیلہ کر کے اُسے ماروں مجھے منظور نہیں
آلِ ہاشم کے گھرانے کا یہ دستور نہیں

ابن زیاد کو شبہ ہوتا ہے۔ وہ انہیں اپنے دربار میں طلب کر کے حضرت مُسلم کے متعلق حالات دریافت کرتا ہے :۔

کہا ہانی نے کہ لا قوۃ الا باللہ۔   میں کجا اور کجا مسلمِ محزون و تباہ

بولا حاکم یہ تجسس یہ خبر ہے واللہ　　لا بھی مسلم کو کہ یہ عذر ہے بد تر زگناہ

ہونگے شمشیر سیادت سے جدا بند ترے

قید ہو جائیں گے ناحق زن و فرزند ترے

ہانی جواب دیتے ہیں :۔

ہے یہ آئین کس اقلیم میں مہمانی کا

نام ہو جائے گا رسوا ہمہ جا ہانی کا

نام آگے نہ مرے مسلم مظلوم کا لے　　رحم دل اس کو حوالے نہ کریگا تیرے

رونگٹے کو ہوا آسیب اگر مسلم کے　　ہوگی وا اندرِ ندامت پسرِ فاطمہ سے

کیا ہوا گر وہ نہیں اُسکے وصی کے صدقے

گھر مرا نام حسین ابن علی کے صدقے

حضرت مسلم کو معلوم ہوا کہ ہانی کو ابنِ زیاد اذیتیں دے رہا ہے ۔ آپکے مددگاروں نے آپ کو جنگ پر آمادہ کیا ۔ اہل کوفہ پچیس ہزار کی تعداد میں دار الامارت پر حملہ کے ارادہ سے پہنچے ۔ لیکن ابن شہاب نامی ایک شخص نے جو ابن زیاد کا دوست تھا لوگوں کو دھمکایا اور یہ اطلاع دی ۔ کہ شام سے فوج روانہ ہو چکی ہے ۔ حضرت مسلم کے طرفدار بے وفائی اور عہد شکنی پر آمادہ ہوئے مجبوراً حضرت مسلم واپس ہوئے :۔

واقعہ نگاری

شام کو داخلِ مسجد ہوئے وہ لوگ تمام　　وقت مغرب کے کیا حضرت مسلم کو امام

ل نہایت باریک بال ۔

پھیرا مسلم نے جونہی بعد تشہد کے سلام — پھر کے دیکھا تو ہیں نو شخص کل اہل اسلام

نکلے مسجد سے تو کیا کیا انہیں وسواس نہ تھا

نو رفیقوں کو بھی دیکھا تو کوئی پاس نہ تھا

اس طرح لشکرِ مسلم جو پراگندہ ہوا — حاکمِ کوفہ نے پھیری یہ منادی اس جا

گھر میں مسلم کو اگر کوئی جگہ دیوے گا — صاحبِ خانہ ہے وہ موردِ آفات و بلا

ناکے[۵۱] روکے گئے اور راہ گذر بند ہوئے

شہر میں مسلمِ مظلوم نظر بند ہوئے

تب کہا حضرتِ مسلم نے کہ اب جاؤں کہاں — واہ کیا خوب یہ سمجھے ہیں حقوقِ مہماں

بھوکے پیاسے شبِ تاریک میں پھیرے سرگرداں — تا درِ خانۂ طوعہ جونہی پہنچے گریاں

اس ضعیفہ کو یہ دیکھا کہ دعا کرتی ہے

در پہ بیٹھی ہوئی کچھ ذکرِ خدا کرتی ہے

بولے مسلم کہ بہت پیاس سے ہوں میں بیتاب — پانی دنیا میں پیاسے کو پلانا ہے ثواب

شہر کا حال دگرگوں تھا جو اٹھی وہ شتاب — آبِ شیریں سے بہ تعجیل بھرا ساغرِ آب

ڈرتے ڈرتے جو حوالے قدحِ آب کیا

طوعہ نے طوعاً و کرہاً اسے سیراب کیا

تھک کے بیٹھے وہیں مسلم اسی دیوار تلے — کہا طوعہ نے کہ اٹھ جا مرے دروازے سے

ہے بہت شہر پہ آشوب یہی ڈر ہے مجھے — رو کے اس پیر ضعیفہ سے کہا مسلم نے

---

۵۱ وہ راستہ جو کسی دوسری جگہ سے ایک مقام پر آنے کے لئے کام دیتا ہو۔

آج کی رات جو گھر میں مجھے مہمان کرے
یہ یقین ہے کہ محمدؐ پہ وہ احسان کرے

کہا طوعہ نے کہ تو کون ہے اے مردِ خدا　　کہا مسلم نے کہ شبیرؑ ہے بھائی میرا
مجھ کو سب کہتے ہیں مسلم ہی علی میرا چچا　　بہ نیابت تھا مجھے ابنِ علی نے بھیجا۔

کوئی دے گھر میں جگہ اس کا فقط طالب ہوں
میں ہی فرزند عقیل ابن ابی طالب ہوں

گر پڑی پاؤں پہ طوعہ جو سنی یہ گفتار　　اور لگی کہنے کہ شہزادۂ عالم پہ نثار
تیرا دیدار ہے فرزندِ نبی کا دیدار　　رونگٹے بر ترے لونڈی کا فدا ہے گھر بار

جان اپنی ترے قدموں پہ میں قربان کروں
شوق سے آ مرے گھر میں تجھے مہمان کروں

طوعہ حضرت مسلم کو مکان میں لے گئی۔ ایک حجرے میں آپ آرام کر رہے تھے۔ ناگاہ فرزند طوعہ مکان میں داخل ہوا۔ اُس نے اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھا سہ

غور سے ماں کو جو دیکھا تو وہ گھبراتی ہے
گاہ حجرے کی طرف جاتی ہے گہہ آتی ہے

والدہ سے یہ لگا کہنے وہ طوعہ کا پسر　　آج تو کچھ متردد مجھے آتی ہے نظر
پیر زن نے کہا تجھ سے مجھے لگتا ہے ڈر　　راز سربستہ کو اظہار کروں میں کیونکر

اُس نے جھوٹی قسم کھائی اور اقرار کیا
ماجرا طوعہ نے مسلم کا سب اظہار کیا

پسر طوعہ ابن زیاد کو اپنے مکان میں حضرت مسلم کی موجودگی کی خبر دیتا ہے۔

جذباتِ غم

تھے مصلّے ہی پہ مسلم ابھی اللہ اللہ صبح کا نور نمایاں ہوا ہنگام پگاہ
کان میں آئی صدائے سمِ اسپانِ ناگاہ کہا بے ساختہ مسلم نے کہ انا للّٰہ

میں تو راضی ہوں جو کچھ مجھ پہ بلا گزرے گی
بعد میرے مرے اطفال پہ کیا گزرے گی

حضرت مسلم مجبوراً مستعد جنگ ہوئے۔ اور باہر آکر یہ حال دیکھتے ہیں ؎

دیکھی اک برق چمکتی ہوئی تلواروں سے
شہر کے کوچے تھے معمور ستمگاروں سے

جوشِ شجاعت

قید کر لینے کی مسلم کے بہت کی تدبیر شیرِ اللہ کے جیتے کہیں ہوتے ہیں اسیر
جب کئی جسمِ مبارک پہ لگے نیزہ و تیر یا حسین ابنِ علی کہہ کے نکالی شمشیر

پھر تو جس سمت جھکے اور جدھر وار کیا
قدِ آدم سے سوا لاشوں کا انبار کیا

شہر میں ایک تلاطم تھا کہ اللہ اللہ کثرتِ خلق یہاں تک تھی کہ مسدود تھی راہ
تھا اس انبوہ میں مشکل گذرِ پیکِ نگاہ لوگ آتے تھے ہزاروں پئے امدادِ سپاہ

مسلم آتے تھے جب اُن بدگہروں کے اندر
ڈر سے چھپ جاتے تھے لوگوں کے گھروں کے اندر

تھا یہی حرف زن و مرد کے منہ سے جاری فوج اس ایک مسافر نے بھگا دی ساری

ایسے کو قتل عبث کرتی ہے قومِ ناری
واہ کیا خوب کی مہمان کی مہمانداری

پر یہ حملے کئے مسلم نے ستمگاروں پر
چڑھ گئے اہلِ ستم خوف سے دیواروں پر

خود بھی تھے فرق سے تا ناخنِ پا خوں میں لال
ڈوبے تھے تن میں کہیں تیر کہیں نیزوں کے بھال

کثرتِ ضرب سے ہوتا تھا دگرگوں احوال
لگ کے دیوار سے ہوتے تھے کھڑے روک کے ڈھال

قبضۂ تیغ کو اور ہاتھ کو خود چومتے تھے
غش جو آجاتا تھا بند آنکھیں تھیں اور جھومتے تھے

واقعہ نگاری

جنگ کا ہو گیا اک آن میں کچھ اور ہی ڈھنگ
دور سے پڑنے لگے سنگ ہزاروں مرجنگ

جب کہ دندانِ مبارک پہ لگا آن کے سنگ
دل سے فرمایا ہم اس وقت ہوئے زیست سے تنگ

طاق طاقت ہوئی اور پشت بدیوار ہوئے
دست و پا مسلمِ مظلوم کے بیکار ہوئے

ہاتھ اک کوفی نے شمشیر کا ایسا مارا
کٹ گیا ہائے قیامت سرِ بالا سارا

جب لگا پشت پہ نیزہ نہ رہا تب یارا
روک کر آگے سپر بیٹھ گیا بیچارا

تیغ کو ہاتھ سے مسلم نہ اٹھا سکتا تھا
رعب سے اس کے کوئی پاس نہ آسکتا تھا

حضرت مسلم گرفتار کر کے ابن زیاد کے دربار میں لائے جاتے ہیں۔ وہاں مکالمہ ہوتا ہے۔ آخر کار آپ کو شہید کر دیا جاتا ہے :۔

حضرت تشفی

حضرت مسلم کی بے کسی کی تصویر جب اہل کوفہ حضرت مسلم کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو ؎

سردارِ فوج بے کس و بے یار ہو گیا
کس گردشِ فلک میں گرفتار ہو گیا

جس وقت کوفی تمام مسلم غازی سے پھر گئے آپ نے چاہا کہ دشمنوں سے چھپ کر کوفے سے باہر نکل چلوں۔ مگر راستے سے واقف نہ تھے۔ اس لئے شاعر کہتا ہے۔ کہ شہر کی گلیوں میں ہر سو بھٹکتے پھرتے تھے۔ خود انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کدہر جا رہے ہیں۔ کہ اس طرف گئے تو کبھی اس طرف پھرے۔ اس سرگشتگی کی حالت میں آپ کی نظر خانۂ طوعہ پر پڑتی ہے۔

واقعہ نگاری

مسلم نے جا کے در پہ جو فرمایا دق باب ۔۔۔ اک عورت آئی اور یہ اس نے دیا جواب
تم کون ہو جو آئے ہو اس دم باضطراب ۔۔۔ ارشاد یہ کیا کہ مجھے ہے تلاش آب
پیاسا ہوں کیا عجب جو جگر تک کباب ہو
پانی اگر پلائے نہایت ثواب ہو

حضرت مسلم طوعہ کے مکان میں مقیم ہیں۔ آپ کے مشاغل کے متعلق ایک بند ملاحظہ ہو:۔

گہ مائلِ رکوع تھے گہ راغبِ سجود ۔۔۔ وردِ زباں کبھی رہی تسبیح یا ودود

بھیجا کبھی نبی پہ کبھی آل پر درود　　کہتے تھے بہرِ طاعت خالق ہے یہ وجود

خاطر سے اپنے دوست[۵] کی اعدا میں آئے ہیں

عقبیٰ درست کرنے کو دنیا میں آئے ہیں

حاکم کوفہ کو حضرت مسلم کی قیام گاہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ شاہی سوار طوعہ کے مکان کو جہاں حضرت مسلم پوشیدہ ہیں گھیر لیتے ہیں۔ اسوقت سواروں کے شور وغل اور جوش کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں :۔

وہ ہنہنانا گھوڑوں کا وہ شورِ کارزار　　وہ کھڑکھڑانا اُن کی لگاموں کا بار بار

وہ غل ہر اک سوار کا پیدل کی وہ پکار　　وہ نعرے اُن نقیبوں کے ہاں ہاں ہنا ہوشیار

دشمن اسی جگہ ہے نہ گھبراؤ گھیر لو

طوعہ کا گھر یہی ہے سنبھل جاؤ گھیر لو

حضرت مسلم مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ طوعہ جانے سے روکتی ہے۔ اور کہتی ہے ؎

لونڈی کا حالِ دل ہے دگرگوں کہاں چلے

یہ گھر تو آپ کا ہے فدا ہوں کہاں چلے

حضرت مسلم جواب دیتے ہیں کہ اب اس گھر میں میرے رہنے کی صورت کوئی نہیں پھر فرماتے ہیں :۔

کیا فائدہ جو قیدیٔ فوجِ یزید ہوں

انسب یہی ہے راہِ خدا میں شہید ہوں

---

[۵] یعنی حضرت امام حسین۔

مرثیہ نگار حضرت مسلم کے سراپا کی تعریف کرتے ہوئے ریش مبارک کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔ کہ

ہے ریش پاک نور سے چہرہ بھرا ہوا

اور چہرے کے متعلق لکھتا ہے۔

شانِ خدا ہے چہرۂ انور ہے نور کا

مگر ساتھ ہی جب حضرت مسلم کی شہادت کا خیال آتا ہے تو شاعر غم سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔ ع

مِٹ جائے گی جہاں سے یہ تصویر نور کی

حضرت مسلم طوعہ کے مکان سے باہر آگئے۔ اور نرغۂ اعدا میں گھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس وقت بے کس اور تنہا ہیں۔ مگر مردانگی میں آپ کسی سے کم نہیں اور دشمنوں کو پکار پکار کر کہتے ہیں ؎

جس کو غرور و کبر شجاعت پہ ہو وہ آئے

نازاں جو اپنی قوت و طاقت پہ ہو وہ آئے

یہ کہکر شمشیر شعلہ بار کو بے نیام کر دیتے ہیں۔ اس وقت یہ عالت ہو جاتی ہے۔ کہ ؎

شمشیر کے نکلتے ہی نکلے تنوں سے دم

کج رو کے واسطے ہوئی سیدھی رہِ عدم

اس کے بعد شاعر تلوار کا عال اس طرح بیان کرتا ہے کہ

بجلی سی کوندتی تھی وہ تلوار چار سو　　ہوتی تھی ناریوں پہ شرر بار چار سو

بے سر پڑے ہوئے تھے ستمگار چار سو   اک تیغ شعلہ بار کے تھے وار چار سو

ہر تن جلا کے سر و چراغاں بنا دیا
ظلمت میں روشنی کا تماشا دکھا دیا

حضرت مسلم کی شجاعت کے سامنے کسی کو تاب مقابلہ نہ تھی۔ دشمن ذلیل ہو کر پسپا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ کہ اگر حضرت مسلم بالکل تنہا ہیں ؎

ناصر کوئی ہے اور نہ مددگار ہے کوئی
حامی کوئی ہے اور نہ طرفدار ہے کوئی

اور اگرچہ دشمن صبح سے جدو کد میں مصروف ہیں مگر ؎

قابو کسی طرح نہیں پاتے دلیر پر
کس طرح فتح یاب ہوں روباہ شیر پر

جب بانیانِ ستم طاقت و مردانگی میں حضرت مسلم کو نیچا نہ دکھا سکے تو اس وقت انہوں نے یہ فریب کیا کہ راستے میں، ایک گڑھا کھود کر خس پوش کر دیا۔ حضرت مسلم جو اس فریب سے واقف نہ تھے، دشمنوں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر آگے بڑھے۔ اور گڑھے میں گر پڑے۔ شاعر کہتا ہے۔ کہ اس وقت

دیکھا میانِ غار جو افتادہ شیر[1] کو   لے لے کے نیزے ہاتھ میں آئے کمینہ جو
پتھر لگائے شیشۂ دل تا کہ چور ہو   کہتے تھے اہل کوفہ کہ ہرگز اماں نہ دو

[1] یعنی حضرت مسلم۔

تیغیں سپر کی آڑ میں سے خوں فشاں چلیں
خنجر چلے حسام چلے برچھیاں چلیں

یہ کہہ کے گرد غار کھڑے ہو گئے لعیں — نوک سناں سے پسلیاں دونوں فگار کیں
سنگیں دلوں کو ہائے نہ کچھ تھا خیالِ دیں — پتھر اٹھا اٹھا کے لگاتے تھے اہلِ کیں

درپے تھے ایک رہبرِ دیں[1] کے کئی ہزار
دشمن تھے ایک جانِ حزیں کے کئی ہزار

ستم شعار چاروں طرف سے حضرت مسلم پر ٹوٹ پڑے۔ اور آپ کو قید کر کے حاکم کوفہ کی طرف لے چلے۔

واقعہ نگاری

ناچار سب کے بیچ میں تھے مسلمِ اسیر — ہمراہ تیغیں کھینچے ہوئے جاتے تھے شریر

اس حالت میں حضرت مسلم پر تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے مگر آپ کو پانی نہیں دیا جاتا۔

حضرت مسلم اِن ستم شعاروں کا یہ سلوک دیکھ کر دل میں نادم ہوتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں کے فریب میں آ کر کیوں امام حسینؑ کو بلایا ہے

بیعت سے منحرف ہوئے کوفی غضب کیا
نادم ہوں کیوں حسین کو میں نے طلب کیا

اپنے انجام کو دیکھتے ہیں تو حضرت امام حسین کی تصویر آنکھوں تلے پھر جاتی ہے۔

---

[1] یعنی حضرت مسلم

دشمن کا بھی سفر میں یوں حال غیر ہو
ہم تو نثار ہوتے ہیں آقا کی خیر ہو

ڈر ہے میانِ راہ نہ دشمن کہیں ستائیں | جو ظلم دیکھنے میں نہ آئے ہوں وہ دکھائیں
بالفرض سوئے کوفہ جو کعبے سے آپ آئیں | اہل حرم کو قبلۂ عالم نہ ساتھ لائیں

عباسِ نامدار جو سرور کے ساتھ ہوں
اکبر روانہ زینبِ مضطر کے ساتھ ہوں

استقبالِ موت

کرتے ہوئے کلام یہ پہنچے قریب بام | بالائے قصر لے گئے کوفی و اہل شام
حاضر تھے دیر سے جو وہاں بہرِ ظلم عام | اُٹھ اُٹھ کے قاتلوں نے بٹھایا یہ مہ جسام

جلاد نے جو تیغ جفا کو علم کیا
مسلم نے کلمہ پڑھ کے سرِ پاک خم کیا

حضرت مسلم کے متعلق اہل کوفہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔

واقعہ نگاری

وہ بیاں کرتا ہے جو جو کہ ہے ارشادِ حسین | یہ ہے آباد سدا خانہ آبادِ حسینؑ
حق کی تائید سمجھتا ہے وہ امدادِ حسین | کبھی مصحف کی تلاوت ہے کبھی یادِ حسینؑ

نام حیدر کا اُسے ورد ہی غازی ہے بڑا
داغ سجدوں کا جبیں پر ہے نمازی ہی بڑا

حضرت مسلم کے ورود کوفہ کی خوشخبری سُن کر شاعر کا دل جوشِ مسرت

سے لبریز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

دل نے یٰسین کے درِ و آلِ نبی پر بھیجا　　اور کہا مجھ سے کوئی اپنی نشانی دے جا
نذرِ تعریف سراپا میں قصیدہ لیجا　　کبھی سرزد نہ زباں سے ہو کلام بیجا
خود بخود عرش سے مضمون اُتر آئیں گے
بگڑے بھی معجزۂ شہ سے سنور جائیں گے

زورِ بیان

جب ہوئی بادشہ کی حکومت اظہار　　طبعِ موزون ہوئی جوں رکنِ سلاطین تیار
عقل سے فہم سے آباد ہوا سب دربار　　عاملِ نطق نے باصدقِ صفا کی گفتار
مدح آمد میں پئے رونقِ تاج آیا ہے
بحر سے گوہرِ مضموں کا خراج آیا ہے

(حضرت مسلم کے سراپا میں سے چشم و ابرو کی تعریف) شاعر نے سراپا نگاری میں تمام زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ مگر اس نکتہ پر غور نہ کیا کہ کس کا سراپا کھینچنا مطلوب ہے۔ ایک پر جلادت و پر وفا سپاہی کا۔ یا کسی حسین محبوب کا:۔

چشم نے روشنی ہر چشمِ خریدار کو دی　　داروئے شربتِ دیدار طلبگار کو دی
گرشِ نرگسِ بیمار نے بیمار کو دی　　آبرو ابروِ خمدار نے تلوار کو دی
تیغ ابرو کے ہیں ہر تیغ سے اسرار جدا
دل ہے قبضے میں پہ خود قبضے سے تلوار جدا

کہیے حلقوم کو اُن کے جو بیاضِ سحری　　فخر میں آن کے خورشید کرے جلوہ گری

ہے گریباں ہو نورات کی ظلمت سے بری　　فلکِ حسن کی گردن کو ہوا طوقِ زری
حوضِ کوثر کا جہاں میں ہے نمایاں ساغر
گردنِ پاک صراحی ہے گریباں ساغر

سینہ گنجینہ شہِ دین کی محبت کا ہے　　صاف ہے زنگ سے آئینہ حقیقت کا ہے
لوحِ محفوظ ہے نقش اس پہ شجاعت کا ہے　　بحرِ صنعت سی نمونہ یدِ قدرت کا ہے
جانبِ حق ہے شہِ دیں کے طرفداروں میں
سینہ ایسا ہی سپر ہوتا ہے تلواروں میں

طوعہ کے گھر میں اپنے آپ کو محصور پاکر حضرت مسلم شمشیر بکف نکلتے ہیں۔ اور محاصرہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس صف شکن حملہ سے محاصرہ کرنے والوں کا دستہ مرعوب ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اُن کے گھوڑے بھی الف ہو جاتے ہیں ؎

کانپے اسوار ڈرے خوف کے مارے گھوڑے
شیر کی بو سے الف ہو گئے سارے گھوڑے

تلوار کی کاٹ

ہو کے شمشیرِ علم فرقِ لعیں سے اتری　　سر سے کیا اتری تنِ دشمنِ دیں سے اُتری
تن سے کیا اُتری وہیں خانۂ زیں سی اتری　　زین سے اتری وہ کیا روئے زمیں سے اُتری
سر و تن پر نہ رُکی اسپ و زیں پر نہ رُکی
سچ ہے سب قبضے میں تھا تیغ کہیں پر نہ رکی

ؔ گھوڑے کا الف ہو جانا۔ دونوں اگلے پاؤں اٹھا لینا۔

میر مونس[1]

غریب الوطنی

انساں کے لئے موت ہی غم بے وطنی کا   جاں کاہ ہے اندوہ و الم بے وطنی کا
صدمہ نہیں کچھ موت سے کم بے وطنی کا   آفت ہے قیامت ہے ستم بے وطنی کا
غربت میں چمن ہے خس و خاشاک سے بدتر
گر تخت سلیماں ہو تو ہے خاک سے بدتر

ہمراہ جو سو طرح کی راحت کا ہو ساماں   پژمردگیٔ دل نہیں جاتی کسی عنواں
پھرتا ہے نظر میں چمن بزم عزیزاں   ہوتا ہی نہیں غنچۂ خاطر کبھی خنداں
ہر گام پہ آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں آنسو
شبنم کی طرح رخ پہ ٹپک پڑتے ہیں آنسو

یہ حال مسافر ہی پہ کچھ خوب ہے روشن   بلبل بھی پھڑکتی ہے جو چھٹتا ہے نشیمن
یاد آتی ہے آسودگیٔ راحت مسکن   ہو جاتا ہے داغوں سے جگر غیرت گلشن
سچ ہے کہ غم بیوطنی سخت الم ہے
پھر آنے کی امید نہ ہو جب تو ستم ہے

حالتِ سراسیمگی

کٹتے تھے عجب فکر و الم میں سحر و شام   جز رنج نہ کھانے کا نہ پینے کا سرانجام
نے بیٹھنے کا چین نہ سونے کا تھا آرام   اک جاں کئی غم لاکھ دکھ اور اک دلِ ناکام
تشویش میں لب خشک تھا منہ چاند سا فق تھا

[1] میر مونس کا مرثیہ انیس کے بعد ہونا چاہیئے تھا مگر سہواً یہاں درج ہو گیا۔

کیوں خط طلب شاہ کو لکھا یہ قلق تھا

اک دوست تھا ہانی سو ہوا قید وہ ذیجاہ | پھر کون تھا اس بے کس و بے پر کا ہوا خواہ
تنہائی سے گھبرانے لگی روح جو ناگاہ | کہتے ہوئے نکلے کہ توکلت علی اللہ

تھا وقت شب اور تازہ مصیبت یہ پڑی تھی
ایک ایک گھڑی صبح قیامت کی گھڑی تھی

دم لینے کا موقع بھی کسی جا نہیں پایا | سرگشتہ و حیراں تھے کہ ہے دیس پرایا
کہتے تھے عجب غدر ہے کیا کیجے خدایا | تقدیر نے بیٹوں سے بھی غربت میں چھڑایا

موت آئی ہے کس وقت کہ پیارا نہیں کوئی
لاشہ بھی اٹھانے کو ہمارا نہیں کوئی

فرزند اگر ہوتے تو کچھ کام بھی آتے | کرتا میں وصیت جو بجا اس کو وہ لاتے
کاندھوں پہ وہی باپ کی میت کو اٹھاتے | دیتے وہ مجھے غسل و کفن قبر بناتے

یاں لوگ سمجھتے ہیں نبی کو نہ خدا کو
اب کون کفن دے گا غریب الغربا کو

اس عالم تنہائی میں جب دم اجل آئے | مظلوم کو قبلہ کی طرف کون پھرائے
کون ایسا ہے یا ہائی جو ذرا منہ میں چوائے | ہے کون جو میت پہ ردا لا کے چڑھائے

ہمدرد بجز بے کسی و یاس نہ ہوگا
یٰسین بھی پڑھنے کو کوئی پاس نہ ہوگا

لہ ہانی کوفہ کا ایک باشندہ تھا۔ جو امام حسین کے ہوا خواہوں میں تھا حضرت مسلم کے ساتھ اُسے بھی ابن زیاد حاکم کوفہ نے قتل کرا دیا۔

طوعہ نامی ایک ضعیفہ سے حضرت مسلم کی ملاقات ہوتی ہے۔ اور وہ رفق و مدارات سے پیش آتی ہے۔ طوعہ سے حضرت مسلم تشنگی کا اظہار کرتے ہیں۔ پانی پی کر جب حضرت مسلم کو ایک گونہ تسکین ہوتی ہے تو آپ بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اپنی حالت کا ایک نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے۔ شاعر ان تمام وارداتِ قلبیہ کو صرف ایک ثانی مصرعہ سے نمایاں کر دیتا ہے ؎

سوچے اُسے کیا زیست میں جسکی خلل آئے
دیکھا سوئے افلاک اور آنسو نکل آئے

حضرت مسلم طوعہ سے اپنے حالات کے سلسلہ میں یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ کہیں حضرت امام حسین معہ اہل و عیال گرمی کے زمانہ میں ادہر تشریف نہ لائیں۔

لطافت ادا

بچوں کا وہ ساتھ اور وہ گرمی وہ تب و تاب
مرجھائیں گے سب باغِ نبی کے گلِ شاداب
وہ پھول سے رخ جن سے خجل لالۂ سیراب
ممکن ہے کہ ہو دھوپ کی گرمی کی انہیں تاب
رستے میں کہیں غنچۂ خاطر نہ کھلے گا
مرجائینگے پانی جو کسی جا نہ ملے گا

ضعیفہ حضرت مسلم کو مکان کے ایک حجرے میں چھپا دیتی ہے رات کے وقت طوعہ کا بیٹا داخل مکان ہوتا ہے

دیکھا جو یہ اس نے کہ تردد میں ہے مادر
حجرے میں کبھی جاتی ہے گہ آتی ہے باہر

پوچھا سبب اس کا تو ضعیفہ ہوئی مضطر کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں کہنے لگی رو کر

کیا اہل وفا تھی کہ نہ بتلاتی تھی طوعہ

منہ زرد تھا اور بید سی تھراتی تھی طوعہ

طوعہ کا بیٹا جو خاندانِ رسالت کا دشمن تھا سُن گُن پاکر اپنی ماں سے حضرت مسلم کا پتہ پوچھتا ہے۔ اور رازداری کی جھوٹی قسمیں کھا کر اس راز کو ابن زیاد تک پہنچا دیتا ہے۔ ابن زیاد کے حکم سے ایک دستہ فوج کا طوعہ کے گھر کا محاصرہ کرلیتا ہے۔ حضرت مسلم کو نرغہ میں گھر جانے کا جب پتہ چلتا ہے تو ؎

اُٹھ کر کہا طوعہ سے کہ اللہ نگہباں

آپہنچی اجل ہوتا ہے رخصت ترا مہماں

زورِ بیاں

فرما کے یہ باہر گئے اس شکل سے باہم بیشے سے نکل آتا ہے جیسے کبھی ضیغم

بر میں تو زرہ ہاتھ میں شمشیر شرر دم لرزہ ہو دلِ شیر کو چتون کا یہ عالم

چھایا ہوا تھا رعبِ حق ایک ایک لعیں پر

عالم دمِ شمشیر کا تھا چینِ جبیں پر

ہاتھوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

کارِ ید قدرت ہے یہ بازو یہ کلائی طاقت یہ کسی شیر کے پنجہ نے نہ پائی

ندرتِ تشبیہ

سینہ وہ کہ جو سامنے تیغوں کے سپر تھا سر کٹنے کی پروا تھی نہ مرجانے کا ڈر تھا

حقا کہ محبت کا وفا کا وہی گھر تھا　　جامے کے تلے جلوہ نما مثل قمر تھا
اس سینۂ روشن پہ زرہ رشک فلک تھی
حلقوں سے عیاں صاف ستاروں کی چمک تھی

ابن اشعث ابن زیاد کا ایک سردار حضرت مسلم کو دھمکاتا ہے۔ کہ چپکے سے ہمارے ساتھ ہو لو۔ تن تنہا ہمارا مقابلہ کرو گے۔ تو سر دینے کے سوا کچھ بھی پھل نہ پاؤ گے۔

واقعہ نگاری

غازی کو پکارا ابن اشعث نے یہ ناگاہ　　کیوں مستعد جنگ ہوئے مسلم ذیجاہ
دربار میں حاکم کے چلو گر مرے ہمراہ　　دلوادوں ابھی تم کو اماں قتل سے واللہ
پچھتاؤ گے دیکھو کف افسوس ملو گے
سر جائیگا پھر کٹ کے اگر یوں نہ چلو گے

ثبات عزم

مسلم نے کہا اب چمن خلد قریں ہے　　حق پر نہ لڑوں یہ مجھے منظور نہیں ہے
حاکم بھی لعیں ہے نرا اور تو بھی لعیں ہے　　ایسوں کی صداقت کا بھلا کس کو یقیں ہے
ظاہر ہے وہ غربت میں جو کچھ جور و جفا کی
میں بھی تو سزا دوں تمہیں اس مکر و دغا کی

تیغ آزمائی

تنہا پہ ستمگاروں کا نرغہ ہوا اک بار　　تیغوں کو علم کرکے مقابل ہوئے خونخوار
غازی نے بھی لی میان سے شمشیر شرربار　　بڑھ کر ملک الموت پکارے کہ خبردار

مر جائیں گے دعویٰ ہے جنہیں جنگ و جدل کا
اس تیغ کا پھل ذائقہ رکھتا ہے اجل کا

خوفِ جنگ

تھے وقت کے رستم جو سوارانِ زرہ پوش اور جن کے تہمتن کے برابر تھی تن و توش
مجروح ہوئے جاتے تھے اُن سب کے بر و دوش باقی تھے کسی کے نہ حواس و خرد و ہوش

رعشہ تھا سراپا میں یہ بیدادگروں کے
ہاتھوں سے چھٹے جاتے تھے دستے تبروں کے

حضرت مسلم کی تیغ کی صفائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

لے جاتی تھی اس رنگ سے خوں جسمِ عدو کا
دھبا بھی نہ منہ پر نظر آتا تھا لہو کا

تلوار کی تعریف

ٹکڑے تھیں کمانیں نظر آتے تھے قلم تیر چلوں سے ملا سکتے نہ تھے اہلِ ستم تیر
سہمے ہوئے کتنے تھے لگائیں کسے ہم تیر چھونے نہیں دیتی ہمیں وہ تیغِ دو دم تیر

اس برق کے حلقے میں ہیں کیا اپنی خطا ہے
ترکش پہ چلا ہاتھ کہ بس جان ہوا ہے

نیزے کی انی گر کسی سرکش نے دکھائی یوں تیغ گری اس پہ کہ گویا اجل آئی
دکھلائی سرِ دست اُسے ہاتھوں کی صفائی بازو سے جدا ہاتھ تھا ساعد سے کلائی

پرزہ ہوا مغفر بھی سیہ رو کی سپر بھی
نیزہ بھی قلم ہو کے گرا خاک پہ سر بھی

واقعہ نگاری

بے جاں ہوئے جب دم جہل و بغض ستمگار
اور زخم لگے جسم پہ مسلم کے بھی دو چار
اس وقت بھی اک دم نہ رکی ہاتھ سے تلوار
آخر کو چڑھے کوٹھوں پہ چھپ چھپ کے جفا کار

جلتا ہے دل اب کیا وہ ستم لاؤں زباں پر
منہ آگ کا برسا دیا اس سوختہ جاں پر

بالآخر حضرت مسلم کو کاری زخم لگتا ہے۔ اخیر وقت میں عمر سعد سے اس طرح وصیت فرماتے ہیں:۔

ادائیگی قرض

مسلم نے کہا اُس سے بہ با دیدۂ خونبار
اس شہر میں مقروض ہوں میں بے کس و ناچار
تو بیچ کے شمشیر و سپر اور مرا رہوار
سب قرض ادا کیجو کہ اٹھوں میں سبکبار

کچھ غم نہیں پھر سر نہ اگر تن پہ رہے گا
یہ بوجھ وگرنہ تری گردن پہ رہے گا

حضرت مسلم دوسری وصیت اپنے تجہیز و تکفین کے بارے میں کرتے ہیں اس میں تاکیدی شان اس طرح پیدا کرتے ہیں ۔؎

اک روز زمانہ سے گزرنا ہے تجھے بھی
کیجیو نہ قصور اس میں کہ مرنا ہے تجھے بھی

میّت کا احترام

مرتا ہے جو غربت میں کوئی مرد مسلماں
کر دیتے ہیں مومن کفن و دفن کا ساماں
ہوتے ہیں شریک آن کے سب صاحب ایماں
تلقیں کوئی پڑھتا ہے کوئی سورۂ قرآں

آزار اُسے وہ کسی صورت نہیں دیتے
دشمن کے بھی مُردے کو اذیت نہیں دیتے

حضرت مسلم کی تیسری وصیت یہ ہے کہ حضرت امام حسین کو حسرتِ دیدار کے بعد یہ پیغام پہنچا دیا جائے:۔

رقتِ جذبات

حالِ زن و فرزند پہ بھی رنج ہے بیکار
ہو آپ سا وارث تو کوئی غم نہیں زنہار
حضرت تو ہیں بن باپ کے بچوں کے پرستار
ہر دکھ میں ہر اک رنج میں آقا ہیں مددگار
ظاہر ہے یتیموں پہ جو لطفِ شہ دیں ہے
قاسم پہ جو شفقت ہے وہ بیٹوں پہ نہیں ہے

بیٹی ہے مری آپ کی دختر کے حوالے
فرزند ہیں اکبر کے اور اصغر کے حوالے
سب گھر ہے مرا زینب مضطر کے حوالے
زوجہ ہے مری بانوی بے پر کے حوالے
کیا منہ جو کہوں میں کہ عزیزوں میں رہے گی
لونڈی کی طرح اُن کی کنیزوں میں رہے گی)

درسِ رضا و تسلیم

فارغ جو وصیت سے ہوئے مسلمِ ناکام
جلاد لعیں کو ملے حاکم سے یہ احکام
سر تن سے قلم کرا سے لیجا کے لبِ بام
پکڑے ہوئے ہاتھ اُن کا چلا تب وہ بدانجام
اس دم بھی نہ تھا شکوہ بے پیر زباں پر
تہلیل کبھی تھی کبھی تکبیر زباں پر
ہر دم یہی کہتے تھے کہ راضی برضا ہوں
یارب میں تری راہ میں سو جاں سے فدا ہوں

بے کس ہوں اسیرِ ستمِ اہلِ جفا ہوں　　شاہد مرا رہیو کہ میں بے جرم و خطا ہوں
اس ظلم کی پرسش اسی دربار میں ہوگی
عادل ہے عدالت تری سرکار میں ہوگی

جذباتِ غم

القصہ لبِ بام جو لایا انہیں سفاک　　تر آنسوؤں سے ہوگیا مسلم کا رخ پاک
فریاد سوئے کعبہ یہ کی با دلِ غمناک　　روحی بفداک اے پسرِ سید لولاک
کرتا ہے سفر خلق سے غمخوار تمہارا
موقوف ہے اب حشر پہ دیدار تمہارا

شہادت فرزندان حضرت مُسلم

حضرت فصیح

محاکات

تیغ کھینچے ہے کھڑا حارث ملعوں سر پہ — نیچی نظروں سے اُسے دیکھتے ہیں ڈر ڈر کر
اُسکی صورت پہ جو معصوموں کی پڑتی ہے نظر — دیکھ کر اُس کی طرف کانپتے ہیں یہ تھر تھر
نہ تو کچھ بولتے ہیں منہ سے نہ کچھ کہتے ہیں
چپکے روتے ہیں کھڑے آنسو پڑے بہتے ہیں

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں ؎

غصہ سے آنکھ وہ ملعون جو دکھلاتا ہے
ایک بھائی کے گلے ایک لپٹ جاتا ہے

دونوں بھائی جلاد سے کہتے ہیں ؎

قتل کرتا ہے بھلا ہم کو جو تو کیا حاصل
نہ تو اس امر میں دیں ہوگا نہ دنیا حاصل

قاتل جواب دیتا ہے۔ کہ تمہیں قتل کرنے سے مجھے ایک گرانقدر
رقم ملے گی:۔

واقعہ نگاری

جب سنا ہائے یتیموں نے یہ مضموں جانکاہ ایک نے ایک کا منہ دیکھ کے کھینچی اک آہ
کہہ رضینا بقضا کہہ کہا انا للہ پھر لگے کہنے یہ بے رحم سی با حال تباہ

اتنی مہلت دے کہ ہم طاعت معبود کریں
پڑھ لیں دو رکعتیں اور سجدۂ مسجود کریں

قاتل نماز کی اجازت دیتا ہے

سن کے یہ بات لئے دونوں کنار دریا کر وضو قبلہ کی جانب ہوا ہر ایک کھڑا

عجز سے رکھتے تھے وہ خاک پہ سر سجدے میں
کرتے تھے ذکر خدا روتے تھے ہر سجدے میں

بڑے بھائی کا ایثار

کرتے تھے حق سے مناجات وہ بچے غمگیں اتنے میں کھینچ کے تلوار کو آیا بے دیں
ہو گیا موت کا اُن دونوں یتیموں کو یقیں بڑے بھائی نے کہا رو کے با آواز حزیں

پہلے تو ذبح مجھے کر یہ گوارا ہے مجھے
چھوٹے بھائی کو نہ کر قتل کہ پیارا ہے مجھے

چھوٹا بھائی کہتا ہے

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کی سنکر گفتار دی قسم اس کو کہا پہلے مجھ ہی پر کر وار
الغرض جس کا وہ سر کاٹنے کو آتا تھا دوسرا جا کے گلے اُسکے لپٹ جاتا تھا

مگر اس ظالم کے دل پر فریاد اور گریہ وزاری کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اور تلوار سے بڑے بھائی کا سر قلم کر دیا۔ اس وقت لکھتے ہیں۔ کہ ؎

چھوٹے بھائی نے لیا گود میں سر بھائی کا
بولا اے بھائی ہوا ٹکڑے جگر بھائی کا۔

اسی سلسلے میں یہ دو شعر بھی بہت پرتاثیر ہیں ؎

چھوڑا تنہا مجھے جنت کو سدھارے بھائی　　تیغ گردن پہ لگی ہائے تمہارے بھائی

ایسی تلوار لگی ہوش سے بے ہوش ہوئے　　ابھی تم کرتے تھے باتیں ابھی خاموش ہوئے

اس کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ ؎

پاس معصوم کے پھر ظالم خونخوار آیا　　جونہی مظلوم نے دیکھا کہ جفا کار آیا
ڈر گیا رونے لگا خوف لیے اک بار آیا

چھوٹا بھائی بھی شہید کر دیا جاتا ہے۔ دونوں لاشیں دریا میں پھینک دی جاتی ہیں۔ اس وقت شاعر کہتا ہے ؎

ہائے دنیا سے پر ارمان وہ محبوب گئے
دونوں لاشے گل مل کے بہم ڈوب گئے

میر دلگیر

واقعہ نگاری

تمہید میری صاحبو بیجا یہ کچھ نہیں
رونے کی جا ہے واقعہ مسلم حزیں
کوفے میں آیا جب وہ وکیل شہ مبیں
ہمراہ اس کے آئے تھے دو طفل مہ جبیں
صورت میں دونوں غیرت ماہ منیر تھے
نو دس برس کی عمر تھی دونوں صغیر تھے

محبت پدری

مسلم کے پاس دولت و جاہ و حشم نہ تھا
دولت تھی اُسکے پاس یہی دونوں مہ لقا
خواہان راحت اُنکے رہے زیست بھر سدا
دونوں کو پاس سے نہ کبھی کرتے تھے جدا
ہر چند دشمنوں کی ہدایت کو آئے تھے
پر ایسا انس تھا کہ پسر ساتھ لائے تھے

ہوتے تھے جمع جب کہ لعینان بد گہر
اور کہتے تھے امام زماں کی کہو خبر
اُن میں جلوس کرتا تھا یوں وہ نکو سیر
دہنے کو ایک بیٹھا تو بائیں کو اک پسر
جو کوئی پوچھتا تھا جواب آپ دیتے تھے
دونوں کے منہ کے بوسے ہر اکبار لیتے تھے

حضرت مسلم کی کوفہ میں یہ حالت تھی ؎
مسلم نہ شب کو سوتے تھے حضرت کی فکر میں
اور بیٹے صبح کرتے تھے مادر کے ذکر میں

اہل کوفہ اپنے قول و اقرار سے پھر گئے، حضرت مسلم کو بچوں کی فکر لاحق ہوئی۔ آپ بچوں کو شہر کے ایماندار قاضی کے سپرد کرتے ہوئے اس طرح فرماتے ہیں ؎

راحت نہ مجھ کو مرکے ذرا ہوگی ایک دم
اُن سے نہ روح میری جدا ہوگی ایک دم

قاضی بچوں کو اپنے لڑکے کی حفاظت میں وطن بھیج دیتا ہے۔ بچے راستہ بھول کر ایک مکان میں جا پہنچے۔ یہ مکان حارث نامی ایک فوجی شخص کا تھا۔ جس نے ان دونوں بچوں کو قتل کیا۔ لیکن اُسکی بیوی خاندانِ نبوت سے محبت رکھتی تھی۔ بچوں نے اپنا حال بیان کیا۔

واقعہ نگاری

اس مومنہ نے دونوں کا جب سنا کلام — بولی کہ اُن کی خبر کرے خالقِ انام
کہنے لگے ضعیفہ سے وہ دونوں لالہ فام — کیوں سُن ہوئی[1] تو سنتے ہی شاہِ نجف[2] کا نام
وہ بولی کانپ اُٹھی ہیں تمہارے کلام سے
شوہر کو میرے بغض ہے حیدر کے نام سے

ان دونوں نے کلامِ ضعیفہ یہ جب سنا — دونوں نے اک زباں کہا جو مرضیٔ خدا
پھرنے سے تھک گئے تھے جو وہ دونوں مہ لقا — آب و طعام ملتے ہی غش کا سا طور تھا
جب دیکھا اس ضعیفہ نے نیند اُن کو آگئی
حجرے کے در پہ قفل وہ اٹھ کر لگا گئی

[1] ”سن ہونا“ خوف کی وجہ سے گم سم ہونا [2] یعنی حضرت علی۔

حارث مکان میں داخل ہوتا ہے۔ حارث اور ضعیفہ میں مسلم اور اُن کے بچوں کے متعلق مذاکرہ۔ ضعیفہ کی لجاجت، حجرے میں قفل دیکھ کر حارث کو شبہ ہونا۔ ضعیفہ کی الحاح وزاری۔

مانی نہ اس کی بات ستمگر نے زینہار — کاٹا وہ قفل تیغ سے ظالم نے ایکبار
جس وقت پہنچا حجرے کے اندر وہ نابکار — گھبرا کے اُٹھے سونے سے وہ دونوں گلعذار

عریاں جو دیکھی تیغ کف روسیاہ میں
سامانِ موت پھر گیا اُن کی نگاہ میں

حارث بچوں کو حجرے سے باہر لے آیا۔ عورت پھر سمجھاتی ہے۔ حارث سخت جواب دیتا ہے۔

دردناک منظر

یہ کہہ کے زلفیں تھام کے وہ کھینچنے لگا — مظلوموں سے لپٹ گئی آکر وہ پارسا
کس درجہ سنگدل تھا وہ مردود بے حیا — تلوار ماری اس کو کہ ہاتھ ہو گیا جدا

ابلیس تھا سوار جو اس بدصفات پر
لے آیا بہر قتل انہیں آبِ فرات پر

لبِ دریا بچوں کی اور حارث کی باہمی گفتگو، حارث اپنے غلام کو اشارہ کرتا ہے، کہ وہ ان بچوں کو قتل کردے۔ وہ پہلے سمجھاتا ہے۔ جب مایوس ہو جاتا ہے تو تلوار پھینک دیتا ہے۔ اور دریا میں کود کر پار ہو جاتا ہے۔ بچے قتل ہونے سے پیشتر نہانے کی درخواست کرتے ہیں۔ حارث شبہ ظاہر کرتا ہے کہ غلام کی طرح تم بھی بھاگ جانا چاہتے ہو۔

بچے جواب دیتے ہیں:۔

اخلاقی جرات اور جذبۂ شقاوت

یہ سن کے اُس سے کہنے لگے دونوں گلعذار
مکر و دغا گھرانے کا اپنے نہیں شعار
ظالم پکار اگر ہو نہانے کے خواستگار
سر کاٹ کر کرونگا تامل نہ زینہار
گر جسم خاک سے ہیں تمہارے اَٹے ہوئے
دریا میں پھینک دوں گا بدن سر کٹے ہوئے

بچوں کا بے نظیر استقلال

دل پر ہوا نہ اس کی کسی بات کا اثر
آیا قریب دونوں یتیموں کے بد گہر
اُس دم دعا یہ کرتے تھے وہ غیرتِ قمر
یارب نہ آئیں کوفے میں سلطانِ بحر و بر
ماں کو ہماری صبر عنایت خدا کرے
وہ دل جلی نہ غم میں ہمارے بکا کرے

تاثیرِ مظلومیت

یہ کہہ کے قتل ہو گئے وہ دونوں خوش سیر
حاکم کے پاس لے گیا سر دونوں بد گہر
حاکم نے دیکھے جس گھڑی وہ چھوٹے چھوٹے سر
مردود آب دیدہ ہوا اُن کے حال پر
چھوٹے سروں کو دیکھ کے صدمہ بڑا ہوا
کرسی سے سات بار لعیں اٹھ کھڑا ہوا

حاکم کوفہ نے حارث کو بھی اس جرم پر قتل کرا دیا۔ کہ اسے گرفتاری کا حکم دیا گیا تھا۔ نہ کہ قتل کرنے کا۔

حضرت تشفی

اسیروں کے جذبات

ہوئے محبوس جو ظلم کے پسر زنداں میں
بے خور و خواب بسر کرنے لگے زنداں میں
رو رو کر کھوتے تھے جی شام و سحر زنداں میں
کہتے تھے لیتا نہیں کوئی خبر زنداں میں

ہوتی بیداد ہے فریاد کیا کرتے ہیں
نہ تو ہوتے ہیں رہا اور نہ ہم مرتے ہیں

قید خانہ کا نگہباں دونوں کو رہا کر کے ایک قافلہ کے ساتھ کر دیتا ہے لیکن ضعف کے مارے ان سے چلا نہیں جاتا۔ قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے اور یہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس موقع پر کہا ہے سہ

جن کا وارث کوئی دنیا سے سفر کرتا ہے
کون پھر اُن پہ ترحم کی نظر کرتا ہے

پھر کہتے ہیں:۔

بے کسی میں کوئی دمساز و مددگار نہیں
جان بچنے کا کوئی آسرا زنہار نہیں
دشمنِ جاں ہیں سبھی کوئی بھی غمخوار نہیں
کون ہے جو کہ یہاں درپئے آزار نہیں

خار پاؤں میں چبھے رنج و الم پاتے ہیں
گوشہ پاتے نہیں چھپنے کو جدھر جاتے ہیں

یہ زیادہ دور نہیں جانے پاتے کہ سحر ہو جاتی ہے دونوں بھائی ایک درخت میں چھپ جاتے ہیں۔ درخت دریا کے کنارے ہے اس لئے پانی

میں دونوں کا عکس نظر آتا ہے۔ ایک کنیز پانی بھرنے آتی ہے اور عکس دیکھ کر بچوں سے کہتی ہے:۔

واقعہ نگاری

کس لئے روتے ہو کیا حال ہے بتلاؤ مجھے
کیوں پریشاں ہر اک بال ہے بتلاؤ مجھے
چشم پُر آب یہ کیوں لال ہے بتلاؤ مجھے
تم مفصل جو کچھ احوال ہے بتلاؤ مجھے
حال سے کیوں نہیں آگاہ مجھے کرتے ہو
میں دغا تم سے نہیں کرنے کی کیوں ڈرتے ہو

کنیز دونوں کو لے کر حارث کی بیوی کے پاس لاتی ہے۔ وہ بڑی خاطر و تواضع کرتی ہے۔ اور ایک حجرہ میں چھپا دیتی ہے۔ رات کو حارث انہیں تلاش کر کے ناکام واپس آتا ہے۔ آدھی رات کے قریب حضرت مسلم کے صاحبزادہ باپ کو خواب میں دیکھ کر رونے لگتے ہیں:۔

واقعہ نگاری و استعارہ

شور رونے کا یکایک جو ہوا حجرے میں
کہا حارث نے یہ کیا غل ہے بپا حجرے میں
کون یہ کر رہا ہے آہ و بکا حجرے میں
بات یہ کہہ کے وہ ملعون گیا حجرے میں
رونے واں مسلم مظلوم کے پیارے دیکھے
دونوں افلاک مصیبت کے ستارے دیکھے

فرزندانِ مسلم کو لعین پکڑ کر باہر لے آتا ہے۔ حضرت مسلم کے صاحبزادے کہتے ہیں۔ کہ اگر تجھے روپیہ چاہیئے تو ہمیں مدینہ لے چل۔ ہمارے ماموں تجھے بہت کچھ دیں گے

ہونگے دل شاد تو انعام بہت دیں گے تجھے
سینے سے حضرت شبیر لگا لیں گے تجھے

پھر کہتے ہیں :-

گھوڑا قاسم جو تجھے دیں گے تو عباس سپر — نیزہ دیں گے تجھے ہم شکل رسول اکبر
تیر بھی سبز کماں بھی تجھے دیں گے اصغر — اپنے کانوں کے سکینہ تجھے دیں گی گوہر
گر سپاہی ہے تو حضرت تجھے خنجر دیں گے
لعل و گوہر سے تری ساری سپر بھر دیں گے

حارث دونوں کو قتل کے ارادے سے فرات کی طرف لاتا ہے، اس کی بیوی بھی ہمدردی کے مارے ساتھ ساتھ آتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ ؎

اُن پہ اس طرح کا ہوتے نہ ستم دیکھوں گی
ہائے کس طور سے سر اُن کے قلم دیکھوں گی

حارث اپنی بیوی کو اُن کا ہمدرد دیکھ کر اُسے قتل کر دیتا ہے۔

اور صاحبزادگانِ مسلم ؎

کہتے تھے اب نہیں بچنے کی کوئی صورت ہے
ایک غمخوار تھی سو اسکی بھی یہ حالت ہے

بالآخر فرزندان مسلم نہایت بے دردی سے شہید کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرتؑ امام میدانِ کربلا میں ہیں۔ اکثر عزیز و رفقا شہید ہو چکے ہیں۔ حضرت مسلم کی بیوی اور اُن کے دو بچے ساتھ ہیں۔ زوجۂ مسلم کو اپنے شوہر کی شہادت اور بچوں کی اسیری کی خبر معلوم ہو چکی ہے باوجود اس کے زوجۂ مسلم حضرت امام حسین علیہ السلام کی مصیبت پر بیتاب ہیں۔ اور چاہتی ہیں کہ دونوں بچے بھی جو اُن کے ساتھ ہیں۔ ماموں یعنی حضرت امام پر نثار ہو جائیں۔ چنانچہ عالم خیال میں فرماتی ہیں:۔

جذبۂ ایثار

سنا ہی ہیں نے ہوئے قتل شہ کے سب انصار ... شہید ہونے پہ ہیں اب عزیز عرش وقار
یہ کیسے بھانجے ہیں ماموں پہ ہوتے نہ نثار ... جو یہ ہی قصد تھا باندھے ہیں کس لئے ہتھیار
بغیر ماموں کے کیونکر بھلا جییں گے یہ
جو مرنے جانے نہیں کیا سدا جییں گے یہ

اپنے دو محبوب بچوں اور اپنے شوہر کے کمال ایثار کا خیال سامنے ہے۔ اور اسی سلسلہ میں فرماتی ہیں:۔

بہن کا جذبۂ غیرت و ایثار

مگر عجب ہے گئے یہ نہ برچھیاں کھانے ... یہ کیا سبب ہوا کیوں دیر کی خدا جانے
لکھے تھے میرے مقدر میں رنج و غم کھانے ... کہینگے سب نے دیا ہوگا ماں ہی نے جانے
سو میں تو جان بھی دے دونگی اپنی آئی پر
ہزار بیٹے اگر ہوں تو صدقے بھائی پر

نہ اب تلک ہوئے ماموں پہ کس لیئے صدقے　　اگرچہ چھوٹے ہیں ناداں پر نہیں ایسے
نہ آنے دوں گی میں اب پاس گرچہ ہیں بیٹے　　نہ میرے مرنے سے کچھ کام اور نہ جینے سے

کبھی نہ آنسو بہائیں میرے جنازے پر
یہ کہہ مروں گی نہ آئیں میرے جنازے پر

زوجۂ مسلم فرماتی ہیں کہ اگر آج مسلم زندہ ہوتے تو میں اُن سے کہتی کہ ؎

خدا کے واسطے تم بھیج دو لڑائی پر
نثار ہوتے نہیں جا کے میرے بھائی پر

محاکات

نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ بیٹے آتے ہیں　　کمال سوچ ہے جلدی قدم اُٹھاتے ہیں
نہ باتیں کرتے ہیں باہم نہ مسکراتے ہیں　　اداس اداس ہیں کچھ دل میں رنج کھاتے ہیں

بڑے کو مدنظر ہے جو ساتھ چھوٹے کا
وہ اپنے ہاتھ میں تھامے ہے ہاتھ چھوٹے کا

بیٹوں کو آتا دیکھ کر زوجۂ مسلم فرماتی ہیں ؎

حسینؑ مرنے پہ ہیں غم میں مبتلا ہوں میں
تمہیں خبر بھی ہے کچھ لاڈلو خفا ہوں میں

بچّے قدموں پر گر کر اظہار حال کرنا چاہتے ہیں۔ ماں اپنے خیال کے مطابق اُن کے ارادوں کو سمجھ کر اس طرح پیش آتی ہیں۔

جب اُن کو گوشے میں خیمے کے ماں نے بٹھلایا کہا میں سمجھی نہ ماموں نے تم کو بھجوایا
اسی سے دیر ہوئی میں نے مدعا پایا رضا دلا دوں میں تمکو عبث یہ غم کھایا

نثار ہونے پہ تم مستعد رہو پیارو
بجا میں آنکھوں سے لاؤں جو کچھ کہو پیارو

دونوں بھائی قتل ہونے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتے ہیں۔ ماں اس طرح کہتی ہے ؎

بجا حواس رکھو اپنے جنگ کرنے کو
جسے حسینؑ کہیں پہلے جائے مرنے کو

زوجہ مسلم بچوں کا جذبۂ شجاعت اس طرح بھڑکا رہی ہیں :-

درسِ شجاعت

ہر ایک صف پہ ہر اک غول پر چلے جانا تم اپنی تیغ کے جوہر سبھوں کو دکھلانا
قدم بڑھا کے نہ زنہار پیچھے ہٹ آنا یہی ہے پھل مری محنت کا برچھیاں کھانا

ملیں جو شمر و عمرو اُن کو نوک لینا تم
جو تیر آئے تو سینے پہ روک لینا تم

بہن کا جذبہ محبت و ایثار

تمہارے ماموں کے جو قاتلوں میں ہو مشہور اسے بھی چھوڑنا جینا نہ پیارو تا مقدور
کرو گے سعی مکرر جو ہو گا کچھ بھی شعور رہے خیال ہر اک بات کا ضرور ضرور

فقط یہ اتنے لئے سب ہے گفتگو پیارو
تمہارے ہاتھ ہے اس ماں کی آبرو پیارو

یہ یاد رکھو جو نرغے میں گھر بھی جاتا تم
نہ اپنے ماموں کو بھر مدد بلانا تم
نہ ساتھ اپنے انہیں خوں میں ڈوبانا تم
نہ زخم کھائیں وہ میداں میں زخم کھانا تم
گنوا دو شوق سے مجھ دل ملول کی دولت
ملے نہ خاک میں پیارو بتول کی دولت

پھر فرماتی ہیں کہ اگر حضرت امام حسین زخمی ہو گئے تو ؎

پھر ایسی جنگ کا کرنا نہ کرنا ایک سا ہے
جو زخمی وہ ہوئے مرنا نہ مرنا ایک سا ہے

پھر حضرت کے بغیر پانی نہ پینے کی ہدایت کرتی ہیں ؎

ملے گا ساغر کوثر مرو گے گر پیاسے
بغیر ماموں کے پانی نہ پینا دریا سے

بچے جواب دیتے ہیں :-

اگرچہ تشنہ دہن ہم ہیں تم نہ کھاؤ غم
ہمارے واسطے اس نہر کا ہے پانی سم
نہ یہ خیال کرو تم تمہارے سر کی قسم
یہ کوئی بات ہے پانی بھلا پئیں گے ہم
بجا ہوا ہیں گو تین دن کے پیاسے ہیں
علیؑ ساقیٔ کوثر کے ہم نواسے ہیں

اب زوجہ مسلم اپنے بیٹوں کو اچھا لباس پہناتی ہیں ؎

ہر ایک روئے نہ کیوں سن کے ایسے حالوں کو
بنا یا دولہا غرض ماں نے مرنے والوں کو

حضرت مسلم کے صاحبزادے سر جھکاتے ہیں ، زوجہ مسلم فرماتی ہیں ؎

ابھی گلے نہ ملوں گی نہ میں بلا لوں گی
گلے کٹاؤ گے جب تم گلے لگا لوں گی

رخصت کے وقت زوجۂ مسلم کی حالت یہ تھی ؎

دل امڈا آتا تھا ہر چند رو نہ سکتی تھی
عجیب یاس سے بیٹوں کی شکل تکتی تھی

حضرت مسلم کی زوجہ بیٹوں کو لے کر اپنے بھائی حضرت امام حسین کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور اس طرح عرض کرتی ہیں :۔

کہا حسین سے جا کر کنیز آئی ہے
تمہارے واسطے دو فدیہ نذر لائی ہے

یہ کہہ کے بھائی کی لیکر بلائیں بیٹھ گئی | یہ بات کہنے لگے بھانجوں سے سبط نبی
کھڑے ہو کس لئے اب بیٹھو لاڈلو تم بھی | رقیہ بولی مناسب ہے اُن کو بات یہی

زیادہ بیٹھ کے صدمے نہ اب سہیں گے یہ
رضا نہ پائیں گے جب تک کھڑے رہیں گے یہ

حضرت مجبوراً اجازت عطا فرماتے ہیں۔ دونوں بچے رخصت ہو کر باہر آتے ہیں۔ عبداللہ حضرت مسلم کے صاحبزادے میدان جنگ میں پہنچتے ہیں۔ سپاہ شام کے سالار عمر ابن سعد کو اس کی خبر ہوتی ہے۔

واقعہ نگاری

یہ سن کے آیا عمر اس گھڑی قریب سپاہ | بغور سامنے کی اس شریر نے جو نگاہ

ا؎ حضرت مسلم کی زوجہ کا نام ہے

تو دیکھا گھوڑے پر اسوار ہے وہ غیرت ماہ یکایک آن کے نزدیک پہنچا عبداللہ

تمام فوج سراسیمہ اور اداس ہوئی

وہ حسن دیکھ کے موقوف بھوک پیاس ہوئی

عمر فوج کو عبد اللہ پر عام حملہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بعض رحم دل لوگ کہتے ہیں ؎

کوئی بھی ظلم بھلا ایسے کو دکھاتا ہے

عجیب شکل ہے پیاری کہ رحم آتا ہے

حضرت عبداللہ کمال شجاعت دکھاتے ہیں۔ لیکن یزید کی فوج شمر کے اُکسانے سے حملہ کرتی ہے اور چاروں طرف سے تیر برسنے لگتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر امام حسین سے کہتے ہیں ؎

زیادہ دل میں سلگتا ہے داغ مسلم کا

قریب ہے کہ بجھا دیں چراغ مسلم کا

یکایک آیا عمر ابن مالک اظلم لگائی تیغ ہوا مرتے دم عجیب ستم

یہ کہہ کے گھوڑے سے غازی گرا کہ مرتے ہیں ہم خبر لو آن کے اے عازمانِ ملکِ عدم

خدا جہاں میں رکھے ماموں جان کے دم کو

یہ کہنا والدہ سے دودھ بخش دیں ہمکو

عبداللہ شہید ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام اُن کی لاش اٹھا کر لاتے ہیں بھائی کی لاش دیکھ کر بھائی کہتا ہے ؎

نصیب بھائی کے مرنے کے ساتھ پھوٹ گئے لڑائی کی نہیں طاقت کہ ہاتھ ٹوٹ گئے

محمد پر اپنے بھائی کی شہادت سے اس درجہ عالم بیخودی طاری ہے کہ فوجِ شام سے مخاطب ہو کر بے اختیار پکار اُٹھے۔

بھائی کا جذبۂ محبت

نکلتے بھائی کا دم دیکھا کیوں غم ہو دوچند ۔ یہ آرزو ہے کہ ہوں جلد اپنی آنکھیں بند
خدا کی راہ میں سر دینا ہے کمال پسند ۔ اجل کے آنے سے ڈرتے نہیں ہیں دانشمند
شہید بھائی ہوئے خاک ایسے جینے پر
لگاؤ برچھیاں آ آکے میرے سینے پر

جنگ کرتے ہوئے عبد اللہ کے بھائی محمد بھی سخت مجروح ہو جاتے ہیں اور مرتے وقت حضرت امام حسین سے ملنے کی تمنا بیان کرتے ہیں۔ حضرت امام قریب پہنچ چکے ہیں :-

محاکات

کہا حسین نے اے جان ہم تو آ پہنچے ۔ قریب لاش پئے ماتم و بکا پہنچے
یہ کہہ کے اور بھی نزدیک فوسوا پہنچے ۔ شریریٹ گئے جب شاہ کربلا پہنچے
قدم جو ضعف سے حضرت کے لڑکھڑانے لگے
زمیں پہ بیٹھ گئے لاش کو اٹھانے لگے

حضرت عباس اور حضرت امام حسین عبد اللہ اور محمد کی لاشیں خیمہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ محمد کی سانس ابھی اکھڑی نہیں ہے۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں

کمال رنج ہے خونِ جگر میں بہتا ہوں
عضب ہے بھائی تو مردہ ہیں اور میں جیتا ہوں

پھر کہتے ہیں :-

جذبۂ غیرت

کبھی فراغ نہ رنج والم سے پاؤں گا   غریب والدہ اس دم جو زندہ جاؤں گا
سبب جو جینے کا پوچھیں گی کیا بتاؤں گا   مقام شرم ہے کیا اُن کو منہ دکھاؤں گا
کہیں گی اچھے بُرے میں تمہیں تمیز نہیں
عزیز جان ہے ، ماموں تجھے عزیز نہیں

منظرِ غم

لو۔ کہہ کے آہ کی گودی میں خود بخود تڑپا   طرف حسین کے نظروں سے پیار سے دیکھا
بس ایک ہچکی کے آتے بدن ہُوا ٹھنڈا   سدھاری روح سوئے خلدرہ
جمال دیکھنے کی منتظر جو تھیں آنکھیں
دہن تو بند ہوا اور کھلی رہیں آنکھیں

حضرت امام حسین اپنی بہن حضرت رقیہؑ زوجہ حضرت مسلم کے پاس اُن کے بچوں کی لاشیں لے جاتے ہیں۔ حضرت رقیہ ضبط وصبر کا مجسمہ بنی ہوئی بیٹوں کو مخاطب کر کے کہتی ہیں :-

ضبط وایثار

پئے جہاد سوئے دشت جانے کے صدقے   تمہارے لڑنے کے خوں میں نہانے کے صدقے
شہید ہونے کے اور نیزے کھانے کے صدقے   تمہارے مرنے کے قربان آنے کے صدقے
ادا ہوئے مرے فرزند و حق مادر سے
میں سرخرو ہوئی زہرا سے اور پیمبر سے)

مرزا دبیر

اندازِ بیان

وہ کون ہیں دو آبلہ پا نازوں کے پالے نعلین کی جا جن کے کفِ پا میں ہیں چھالے
پیوست ہیں خار آبلوں میں کون نکالے بابا نہیں جو کاندھے پہ دونوں کو اٹھالے
رہ سکتے ہیں جنگل میں نہ آسکتے ہیں گھر میں
ہیں مثل مہ و مہر شب و روز سفر میں

مرثیہ نگار حضرت مسلم کے بچوں کی خستہ حالی دکھا کر اُن کے واقعۂ بعد از شہادت کی طرف کس قدر بامحل کنایہ سے کام لیتا ہے ؎

تقدیر میں کپڑا انہیں اب کوئی جہاں کا
قسمت نے کفن قطع کیا آبِ رواں کا

فرزندانِ حضرت مسلم کو حارث کی زوجہ نے اپنے مکان میں پناہ دی تھی ۔ جب حارث اس کے خاوند کو اس کا علم ہُوا ۔ تو وہ نہایت بے درد ہو کر حاکم وقت سے انعام حاصل کرنے کی غرض سے آمادۂ قتل ہے ۔ کم سن بچے حارث کے ظالمانہ رویہ سے بیزار ہو کر ہر طرح سے منت و سماجت کر رہے ہیں ۔ اور وہ اس کی پروا نہیں کرتا ۔ حارث اپنے مکان سے کشاں کشاں حضرت مسلم کے بچوں کو لئے جا رہا ہے ۔ زوجۂ حارث پیچھے پیچھے خود بھی چلی آتی ہے ۔

محاکات

بیچاروں کے تن کانپتے ہیں دل ہیں اچھلتے حارث جو ڈراتا ہے تو پھر جلد ہیں چلتے

کانٹے ہیں گڑے پاؤں ہیں گھر گھر ہیں مچلتے　　اب آنسو کی جا ٹکڑے جگر کے ہیں نکلتے

گر گر پڑے ہیں چھوٹے سے عمامہ بھی سر سے

مظلوم اُٹھاتے نہیں بے رحم کے ڈر سے

بڑے بھائی کا جذبۂ محبت

چھوٹے کو بڑا بھائی ہی بڑھ بڑھ کے بچاتا　　ہر بار ہے مصحف کی طرح بیچ میں آتا

رو دیتا ہے کچھ کہنے کا موقع نہیں پاتا　　بے ساختہ یہ حرف زبان پر بھی ہے لاتا

سن حال غریبوں کا خدا کے لئے دم لے

اب ہم ترے گھر میں کبھی آئیں تو قسم لے

پر درد بیان

سنتا نہیں مظلوموں کی اک بات ستمگر　　دیتے ہیں ندا زوجۂ حارث کو وہ مضطر

یہ جانتے تو ہم کبھی آتے نہ ترے گھر　　مہمانوں کو اپنے تو بچاتی نہیں آکر

چھڑوا دے کہ پکڑے ہوئے زلفوں کو عدو ہے

اماں نہیں بابا نہیں جو کچھ ہے سو تو ہے

واقعہ نگاری

بالوں کو بکھیرے ہوئے وہ مومنہ ہے ساتھ　　مظلوموں کو ظالم سے چھڑاتی ہے وہ خوش ذات

گہہ پاؤں پہ سر رکھتی ہے گہہ جوڑتی ہے ہات　　کہتی ہے خدا کیلئے کیا کرتا ہے ہیہات

بس بس کہ زمیں اب تو ہلی جاتی ہے ظالم

زہرا مجھے سر ننگے نظر آتی ہے ظالم

حارث اپنے بیٹے کو حکم دیتا ہے کہ بچوں کو قتل کردے۔ حارث کا

لڑکا بچوں سے اُن کے خاندان کا نام دریافت کرتا ہے۔ بڑا بھائی جواب دیتا ہے۔

بولا وہ کہ اکبر ہیں عزیزوں میں تمہارے
رو کر کہا ہاں بیٹے ہیں ماموں کے ہمارے
سب بھائیوں میں ہم علیِ اکبر کو ہیں پیارے
کیا دخل حضورؐ اُنکے کوئی دم بھی جو مارے
ہم گھٹنیوں عباس کے سینہ پہ چلے ہیں
ہم زینب و کلثوم کی گودی میں پلے ہیں

یہ سنتے ہی گرد اُن کے پھرا حق کا وہ شیدا
دریا میں گرا تیغ ٹیک کر لبِ دریا
اللہ کی رحمت میں ہوا غرق سراپا
حارث نے کہا حق پدر یہ تھا تو بولا
حاشا تو پدر کس کا شقی ازلی ہے
ماں فاطمہ ہے مومنوں کی باپ علی ہے

حارث نے خود دونوں بچوں کو شہید کر دیا۔ لیکن حاکم کوفہ نے حارث کو بچوں کی معصومیت سے متاثر ہو کر قتل کر دیا۔

واقعہ نگاری

جب کہ زنداں سے چھٹے راحت جانِ مسلم
اور ہوئے گھر کو رواں روح روانِ مسلم
نوحہ خواں رنج سے تھے فاتحہ خوانِ مسلم
جا بجا ڈھونڈھتے پھرتے تھے نشانِ مسلم
داخلِ خانہ حارث جو وہ ناداں ہوئے
بولی تقدیر کہ یہ موت کے مہماں ہوئے

سلہ قاتل فرزندانِ مسلم سلہ موت کا مہمان ہونا۔ موت کے قریب ہونا۔

گرد گیسوئے معنبر پہ ہے جنگل کی پڑی　　باپ اور ماں کی انہیں یاد ہے ہر ایک گھڑی
موت بھی منتظر وقت ہے خاموش کھڑی　　صبح کو ان پہ جفا ہوئے گی اس گھر میں بڑی

گوشۂ امن نہیں دونوں کا مقتل ہے یہ
سفر آخرت و منزل اول ہے یہ

دونوں بھائی باپ کے شربت دیدار کے پیاسے ہیں۔ اور بار بار باپ کے متعلق دریافت کرتے ہیں :۔

زوجہ حارث کی لگی رونے یہ سن سن کے بیاں　　اور کہنے لگی کرتے ہو جو تم آہ و فغاں
خون ہے اشک کے بدلے مری آنکھوں سے رواں　　نہ کرو صو فرقت مسلم سے میں تم پر قرباں

سن کے یہ بات ید اللہ کے نواسوں نے کہا
کیوں ہمیں دیکھ کے سب روتے ہیں تبلاؤ ذرا

کیا ہم یتیم تو نہیں ہو گئے۔ زوجۂ حارث چپ ہے، اور کوئی جواب نہیں دیتی۔ آخر انہیں ایک حجرۂ تاریک میں چھپا دیتی ہے۔

حارث نجس نے ناگاہ کیا گھر میں گذر　　اور زوجہ سے لگا کہنے یہ وہ بد اختر
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں ملتے نہیں مسلم کے پسر　　ہاتھ لگ جائیں مرے وہ تو کروں میں بے سر

مومنہ نے یہ ستمگر سے کہا اے غدار
لے نہ تو نار جہنم کو برائے دینار

ادھر حجرے میں مسلم کے جگر گوشوں کی یہ حالت تھی ؂

کروٹیں لیتے تھے پر نیند نہ آتی تھی ذرا　　چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے آخر یہ کہا
گو در حجرہ یہاں بند ہوا ہے بھائی　　کر دعا باب اجابت تو کھلا ہے بھائی

میسمریزم

لطافتِ تشبیہ

قید سے جب پسرِ مسلم بے پر چھوٹے ‏ بے کس و بے وطن و عاجز و مضطر چھوٹے
بعد اک سال کے وہ دونوں برادر چھوٹے ‏ چھوٹے سے سن میں بڑے رنج اٹھا کر چھوٹے
دوڑتے تھے کبھی گھبرا کے کبھی گرتے تھے
شبِ تاریک میں دو چاند پڑے پھرتے تھے

محاکات

راہ چلنے سے جو واقف نہ تھے وہ رشکِ قمر ‏ جاتے تھے روتے ہوئے گاہ ادھر گاہ ادھر
نہ کوئی دوست، نہ ہمدرد نہ کوئی رہبر ‏ چوکیداروں کی صدا سن کے لرزتے تھے جگر
دل اُلجھتے تھے بدن بید سے تھرتھراتے تھے
رنگ مہتاب سے چہروں کے اڑے جاتے تھے

کبھی دوڑے کبھی ٹھہرے کبھی آہستہ چلے ‏ خوف یہ تھا کہ کہیں دشمنِ دیں دیکھ نہ لے
بولتا کوئی تو چھپتے تھے وہ نازوں کے پلے ‏ زیرِ دیوار کبھی گاہ درختوں کے تلے
پتے جھونکوں سے ہوا کے جو کھڑکنے لگتے
ننھے سے سینوں میں دل اُن کے دھڑکنے لگتے

اپنے گھر سے جو کبھی دن کو نہ نکلے باہر ‏ رات کو عالمِ غربت میں بھلا جائیں کدھر
خوف ایک ایک قدم چھوٹے سے سن جان کا ڈر ‏ ملکِ دشمن کا نہ مال سر پہ نہ عمو نہ پدر
قید سے چھٹ کے بھی راحت کی نہ صورت دیکھی

شہر سے نکلے تو جنگل کی مصیبت دیکھی

وہ شبِ تار وہ صحرا کی ڈرانی آواز — طائرِ روح کرے دیکھ کے جس کو پرواز
کبھی دیکھا نہ تھا دنیا کا نشیب اور فراز — ہر قدم ٹھوکریں کھاتے تھے وہ پروردۂ ناز
اشک رخساروں پہ آنکھوں سے ڈھلے جاتے تھے
دونوں روتے ہوئے کانٹوں پہ چلے جاتے تھے

جذباتِ غم

کہتا تھا رو کے بڑے بھائی سے چھوٹا ہر دم — بیٹھ کر اب کہیں دم لو نہیں اُٹھ سکتے قدم
دوڑتے دوڑتے سینہ میں سماتا نہیں دم — منزلیں چلنے سے بھائی کبھی واقف نہیں ہم
باپ کے ساتھ تو راحت سے ادھر آئے تھے
تا بہ کوفہ ہمیں گودی میں پدر لائے تھے

بڑے بھائی کی محبت

اس سے کہتا تھا بڑا بھائی بچشمِ گریاں — تم مری گود میں آؤ میں تمہارے قربان
باپ کے وقت کی راحت کا بھلا کیا ہو بیاں — اب تو ہم بے کس و تنہا ہوئے بابا ہیں کہاں
جو مقدر میں ہے وہ جور و جفا دیکھیں گے
کیا خبر تھی کہ یتیمی کی بلا دیکھیں گے

واقعہ نگاری

ناگہاں صبح پہ ظاہر ہوئے آثارِ سحر — صبح کے ہوتے ہی فق ہو گئے وہ رشکِ قمر
دیکھا اک چشمۂ شیریں کے کنارے پہ شجر — جا کے اس نخل میں پنہاں ہوئے مسلم کے پسر
اور راحت نہ کہیں گیسوؤں والوں کو ملی

امن کی جا وہیں اُن تازہ نہالوں کو ملی

آفتابہ لئے حاضر ہوئی واں اک زن پیر — ایک جا اُس کو نظر آگئے دو ماہ منیر
اس کا منہ دیکھ کے گھبرا گئے وہ طفلِ صغیر — تب ضعیفہ نے قریب آن کے یہ کی تقریر
یہ تو میں سمجھی کہ آوارہ وطن ہو دونوں
کون سے باغ کے تم غنچہ دہن ہو دونوں

حضرت مسلم کے صاحبزادے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ ہم غربت زدہ اور بے وطن ہیں۔ ہماری ماں تو یثرب میں ہے۔ اور باپ کوفے میں شہید ہو گئے۔ ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ انتہا یہ کہ دو دن سے خوراک تک نصیب نہیں ہوئی۔

تاثیر بیان

جو مصیبت ہے کہاں تک کریں تجھ سے بیاں — ڈھونڈتے پھرتے ہیں سر کاٹنے کو دشمنِ جاں
جس جگہ چھپ رہیں ایسا نہیں ہے کوئی مکاں — قید سے چھوٹ کے بھاگے ہیں مگر جائیں کہاں
چوکیاں بیٹھی ہیں ہر سمت جفاکاروں کی
کون غربت میں خبر لے وطن آواروں کی

اخلاق

تو نے رو رو کے جو احوال ہمارا پوچھا — ماں کی شفقت ہمیں یاد آگئی اس دم بخدا
صاحبِ درد ہے دیوے تجھے اللہ جزا — گر کے قدموں پہ وہ بولی کہ یہ لونڈی ہو فدا
سمجھی ہیں برجِ شرافت کے ستارے ہو تم
ہے غضب مسلمِ مظلوم کے پیارے ہو تم

ضعیفہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرت مسلم کے صاحبزادے ہیں۔ وہ انہیں کمال محبت و شفقت سے اپنے گھر لے جاتی ہے :۔

آئے دروازے سے جب صحن میں وہ رشکِ قمر جلوۂ حسن سے پر نور ہوا سارا گھر
فرش کرنے لگی حجرے میں زنِ نیک سیر کہا لڑکوں نے ہمارے لئے تکلیف نہ کر

جب سے بابا سے چھٹے رنج و الم سہتے ہیں
اب تو عادت ہے کہ ہم خاک پہ سو رہتے ہیں

اک زمانہ تھا کہ چھاتی پہ سلاتے تھے پدر تخت اور خاک ہے یکساں ہمیں اب اے مادر
سال بھر قید میں افتادہ رہے مٹی پر بوریا بھی نہ میسر ہوا کیسا بستر

پاؤں زنجیر میں طوقوں میں گلے رہتے تھے
ہاتھ تکیے کے عوض سر کے تلے رہتے تھے

نماز پڑھ کر دونوں بچے ایک حجرے میں جا کر سو رہتے ہیں۔ اس اثنا میں ضعیفہ کا لڑکا جو انعام کے لالچ میں حضرت مسلم کے صاحبزادوں کو تلاش کر رہا تھا، مکان پر آیا اور ماں (ضعیفہ) سے اپنی پریشانیوں کا حال بیان کرنے لگا۔ ضعیفہ اُسے سمجھاتی ہے کہ ؎

حق تعالیٰ بھی یتیموں پہ کرم کرتا ہے
کوئی بن باپ کے بچّوں پہ ستم کرتا ہے

پھر کہتی ہے۔ کہ

واجب الرحم ہے ذریتِ سلطانِ عرب ایسے بچوں کو پکڑتا ہے کوئی ہائے غضب
کم سنی، بے وطنی، بے پدری، رنج و تعب تجھ کو مسلم کے یتیموں سے بھلا کیا مطلب

بے وطن جو ہیں انہیں رہنے کی جا دیتے ہیں
لوگ کچھ دے کے اسیروں کو چھڑا دیتے ہیں

ادھر ضعیفہ اور اس کے لڑکے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر حضرت مسلم کے صاحبزادوں نے اپنے پدر محترم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ اور اُن پر رقت و گریہ کی کیفیت طاری ہو گئی رونے کی آواز سن کر ضعیفہ کے لڑکے نے حجرے میں ادھر ادھر تلاش کرنا شروع کیا۔ اور جب ان بچوں کو دیکھا تو:۔

تیغ اٹھا کر یہ کہا کس کے ہو تم نور نظر ... ڈر کے وہ بولے کہ ہم دونوں ہیں مسلم کے پسر
تیرے مہمان ہیں تلوار مسلم ہم پہ نہ کر ... یہ سخن سنتے ہی دوڑا وہ لعین بد اختر

دونوں بچوں پہ جھکا تیغ جفا جو پکڑے
ایک کے ہاتھ اور اک بھائی کے گیسو پکڑے

محاکات

ڈر گئے سہم گئے کانپ گئے بیچارے ... اور اسی حال میں ظالم نے طمانچے مارے
سوسنی ہو گئے جو پھول سے تھے رخسارے ... دمبدم جوڑتے تھے ہاتھ وہ پیارے پیارے

تھا جو بدعت پہ کمر ظالم بدخو باندھے
کس کے اک رسی میں اُن دونوں کے بازو باندھے

یوں ہی شب بھر تو رسن بستہ رہے وہ گلرو ... صبح کو لے کے چلا نہر پہ دونوں کو عدو
تیغ اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں پکڑے گیسو ... نرگسی آنکھوں سے ٹپکتے تھے وہ بچے آنسو

آنکھ اٹھاتے تھے جدھر موت نظر آتی تھی

پیچھے سر کھوئے ضعیفہ بھی چلی جاتی تھی

ضعیفہ نے نہایت منت سماجت کی مگر حارث (اس کے لڑکے) نے اس کا کہنا نہ مانا۔ بے رحم حارث نے انعام کے لالچ میں دونوں بچوں کو قتل کر دیا اور پھر ع

دونوں سر چاند سے لیکر سوئے دربار چلا

دربار میں جب اس واقعہ کی تفصیل پوچھی گئی تو حارث بچوں کی حالت اس طرح بیان کرتا ہے۔ کہ ؎

کہا ظالم نے کہ دہشت سے مرے جاتے تھے
ننھے سے ہاتھوں کو جوڑے ہوئے تھراتے تھے

برادرانہ ایثار

جب بڑھا دونوں پہ میں تول کے ننگی تلوار
بھائی بھائی ہیں یہ اب تک کبھی دیکھا نہیں پیار
بڑھ کے کہتا تھا یہ چھوٹا میرا سر تن سے اتار
سر جھکاتا تھا بڑا بھائی کہ پہلے مجھے مار

پاؤں پیچھے نہ کسی بھائی کا ہٹ جاتا تھا
دوڑ کر تیغ سے ایک ایک لپٹ جاتا تھا

تاثیر بیان

پردیس میں مسلم کے یتیموں پہ جفا ہے
مظلوموں پہ آفت کا فلک ٹوٹ پڑا ہے
بابا ہے نہ ماموں ہے نہ مادر نہ چچا ہے
ہے سامنے آنکھوں کے اجل سر پہ خدا ہے

کیا گلشن فردوس میں گھبراتے ہیں مسلم

آتے ہیں در خلد پہ پھر جاتے ہیں مسلم

محاکات

مظلوموں کو حارث نے طمانچے جو ہیں مارے ۔ نیلے ہیں غضب دونوں کے رخسار وہ سارے
ہیں ہاتھ کو عارض پہ دھرے درد کے مارے ۔ کہتے ہیں کہ بابا نہیں افسوس ہمارے
ماموں نہیں کس سے کہیں اس جور و ستم کو
جو پاتا ہے پردیس میں دکھ دیتا ہے ہمکو

کوئی تو ہمیں قید ستم میں ہے پھنساتا ۔ اور کوئی طمانچے ہمیں بے جرم لگاتا
گھڑکی کوئی دیتا ہے کوئی تیغ اٹھاتا ۔ ہر ایک خریدار ہے سر کا نظر آتا
ہاں سینہ میں دل درد و ندامت سے ہلے گا
مارے گا جو ہم کو کوئی کیا اسکو ملے گا

تاثیر بیان

کس سے کہیں پانی نہیں دو دن سے پیا ہے ۔ کس سے کہیں حارث نے ستم ہم پہ کیا ہے
بابا بھی چھٹے ماں بھی چھٹیں گھر بھی چھٹا ہے ۔ کہتا ہے کہ پیاسا تجھے ماروں تو بجا ہے
یہ شاد ہے ہم مرتے ہیں پانی کی ہوس میں
انسان نہ ہووے کسی انسان کے بس میں

نعلین ہے پانوں میں نہ عمامہ ہے سر پہ ۔ فاقوں کے سبب کانپتے ہیں پاؤں بھی تھر تھر
رخ زرد ہیں لب خشک ہیں منہ آنسوؤں سے تر ۔ لایا ہے انہیں کھینچ کے گھر سے جو ستمگر

سلہ ڈرانا۔ دھمکانا۔ سلہ پانو متروک ہے پاؤں لکھنا اور بولنا چاہیئے۔

اس غم سے گریبانِ سحر چاک ہوا ہے
بدلی ہوئی کچھ اور ہی دنیا کی فضا ہے

فرزندانِ مسلم حارث سے کہتے ہیں کہ تو ہمیں قتل نہ کر، اگر تجھے روپیہ کی خواہش ہے تو ہمیں نجف لے چل۔ وہاں لوگ تجھے مالا مال کر دیں گے۔ حارث جواب دیتا ہے:۔

شقاوت

میں رحم نہ کھاؤں گا یہ مجھ کو نہ سناؤ
اب بہرِ حمایت شہِ مرداں کو بلاؤ
حیدر کے نواسے ہو کوئی زور دکھاؤ
جیتا نہیں چھوڑوں گا اب آنسو نہ بہاؤ
حسرت سے نظر کرتے ہو کیا گھر کی طرف کو
بلواؤ مدد کے لئے اب شاہ نجف کو

اسی سلسلہ میں یہ بیت بھی خوب ہے ؎

نانا کو حمایت کے لئے یاد کرو تم
اب شاہِ نجف سے مری فریاد کرو تم

آخر کار بچے شہید کر دیئے جاتے ہیں۔)

اُردو مرکز کی خدمات کے متعلق

مشاہیرِ مُلک کی رائیں

خان بہادر ڈاکٹر سر محمد شفیع کے سی ایس آئی سی آئی ای

ایل ایل ڈی۔ ڈی لٹ سابق وزیر تعلیم گورنمنٹ ہند

مزنگ روڈ لاہور

۱۸ اکتوبر ۱۹۲۷ء

میں مولینا تاجور نجیب آبادی پروفیسر ڈی ایس کالج کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ اُنہوں نے مجھے اردو مرکز کی مطبوعہ چند جلدیں ہدیہ کر کے اس بات کا موقعہ دیا کہ میں اس نئی تحریک کے مقاصد اور کام کے متعلق رائے قائم کر سکوں۔ یہ جلدیں اردو مرکز کے مقصدِ اوّل یعنی "اُردو لٹریچر کے ذخیرۂ بیکراں میں سے اس جاندار اور مفید حصہ کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ حتیٰ الامکان تاریخی ترتیب کے ساتھ مجلدات میں شائع کرنا" کے حصول میں احتیاط کے ساتھ مرتب کرنے کے بعد شائع کی گئی ہیں اور اردو لٹریچر میں یقیناً ایک قابل قدر رتبہ حاصل کریں گی۔ اُردو نظم و نثر میں سے جس طرح مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ وہ نہایت مستحسن ہے۔ اور ان اشاعات کو دلچسپ بنانے کے لئے مختلف مصنفین اور شاعروں کی

خوشنما تصاویر مضامین کی خوبی کو دوبالا کرتی ہیں۔ میں اُردو مرکز کو اُن کے مساعیٔ جمیلہ کی اس کامیاب ابتدا پر مبارکباد دیتا ہوں۔ میری رائے ناقص میں اہلِ زبان و دیگر شائقین اردو کا فرض ہے کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں امداد کریں۔

خان بہادر شیخ سر عبدالقادر بی اے بار ایٹ لاء

اُردو مرکز لائبریری

ادب اردو کے بہترین نمونے ایک سلسلہ کتب کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ اور اس سلسلے کا نام "اردو مرکز لائبریری" رکھا گیا ہے۔ نام تو ایسا خوبصورت نہیں۔ مگر سلسلہ خود بہت پسندیدہ ہے۔ کچھ عرصہ ہوا۔ مولینا تاجور صاحب۔ نجیب آبادی کی کوشش سے ادیبوں کی ایک جماعت لاہور میں قائم ہوئی جس نے یہ تہیہ کیا۔ کہ اردو نظم و نثر کے علمی و ادبی خزانے سے کچھ بے بہا چیزیں یکجا کر کے اردو خوان دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس مرکز کا نام "اردو مرکز" تجویز ہوا۔ صوبجات متحدہ سے بعض نامور ادیب بھی آکر مولینا تاجور اور ان کے رفقائے پنجاب کے شریک کار ہوئے۔ اور انہوں نے نہایت جانفشانی سے نظم و نثر کے عمدہ انتخابات فراہم کئے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ فی الحال تیس جلدوں میں شائع ہوا

ہے۔ان میں ایک سلسلہ گیارہ جلدوں کا ہے۔جس میں مختصر فسانے یا فسانوں کے ٹکڑے ہیں۔دوسرا سلسلہ تیرہ جلدوں کا ہے۔اس میں مرثیوں کے ایسے حصّے ہیں۔جو عام ادبی دلچسپی کے لحاظ سے نظم اردو کی جان ہیں۔۶ جلدیں دیگر اصناف نظم کے انتخابات کے لیئے وقف کی گئی ہیں اور ایک جلد میں زمانہٴ حال کے ایک نامی ادیب جناب جگت موہن لال صاحب رواںؔ کی رباعیات ہیں ہر جلد بالاوسط کوئی ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب ہے۔جس میں کاغذ کتابت اور چھپائی کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔اور ہر کتاب میں مشہور مصنّفین اردو کی تصویریں ہیں۔جو اس کی دلآویزی کو بڑھاتی ہیں۔ہر سلسلے کی پہلی جلد کے شروع میں اس مضمون کے متعلّق ایک دلچسپ دیباچہ ہے۔اِن خصوصیات کے لحاظ سے یہ ”لائبریری“ اپنی طرز کا پہلا مجموعۂ کتب ہے۔جو ہندوستان میں شائع ہوا ہے۔امید ہے کہ صاحبانِ ذوق اسکی قدردانی میں ویسی ہی فراخ حوصلگی دکھائینگے جس قدر اسکے جمع کرنے والوں اور شائع کرنے والوں نے دکھائی ہے۔اس کی اشاعت کا بوجھ تمام تر ”میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز“ کے علم دوست اور مستعد مالکان نے اپنے ذمّہ لیا ہے۔اور اس سلسلے کو دل پذیر بنانے کے لیئے انہوں نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا ہے۔ادب اردو پر اُن کا یہ احسان قابل قدر ہے۔اور مولینا تاجور اور ان کے رفقائے کار کی یہ ادبی خدمت اردو زبان کے سب دوستوں اور خیرخواہوں کے دلی شکریہ کی مستحق ہے۔

اُردو مرکز کے ارکین وقتاً فوقتاً اِس تجویز کے متعلق انتخابات کے بارے میں مجھ سے مشورہ لیتے رہے ہیں اور گو مجھ سے کوئی معتدبہ خدمت اِن کی بن نہیں

پڑی۔ تاہم یہ میرے لئے باعث مسرت ہے کہ ایسے مفید کام میں شرکت کا موقع مجھے بھی میسر آیا۔

خان بہادر نواب سید اشرف الدین احمد۔ سی آئی۔ ای۔

ممبر لیجسلیٹو اسمبلی۔ فیلو کلکتہ یونیورسٹی

ملک کی مشہور علمی سوسائٹی "اردو مرکز لاہور" آنریبل سر عبدالقادر کی زیر ہدایت اور پروفیسر تاجور ایڈیٹر اخبار اتحاد کی زیر نگرانی اردو زبان کی جو گراں مایہ خدمات انجام دے رہی ہے۔ قابل صد ہزار تحسین و آفرین ہے۔ تمام اردو لٹریچر کا ترتیب تاریخی کو ملحوظ رکھ کر انتخاب کرنا درحقیقت اردو زبان کا ایک مکمل اور جامع انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کے ہم معنی ہے۔ اردو مرکز کا یہ علمی پروگرام نہایت شاندار ہے۔ مگر اس سے زیادہ شاندار جماعت اعدد مرکز کا نمود و شہرت سے دور رہ کر اس کام کی تکمیل کے لئے خاموش انہماک ہے۔ اردو دنیا عام طور پر اردو مرکز کی ہستی سے اس لئے بے خبر تھی۔ کہ اس سوسائٹی کی جانب سے لمبے لمبے رعب انگیز اعلان نہیں شائع کئے گئے تھے۔ ان اعلانات کی بجائے اچانک اور غیر متوقع طور پر اس کے کام کی پہلی قسط تیس مجلدات کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ مجھے یہ مفید تالیفات دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ میں کہہ

سکتا ہوں کہ اردو مرکز اگر اپنی پوری زندگی میں بھی صرف یہی مجلدات شائع کرتا۔ تو وہ اپنے لیئے عزت دوام حاصل کر سکتا تھا۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں لٹریچر کا انتخاب درحقیقت اُن زبانوں کی زندگی کا حاصل ہوا کرتا ہے۔ اردو مرکز کے انتخابی نظام کے ذریعے اردو زُبان کے شرائین میں روح زندگی پھونکی جا رہی ہے۔

اردو ادب کے اس پروگرام کی تکمیل پر اندازہ ہو سکے گا کہ اردو زبان نے اپنے کس کس شعبے میں کیا کیا ترقیاں کی ہیں۔ اور کونسا شعبہ تشنۂ ارتقا ہے۔ اسی کے ساتھ اردو مصنفین اردو مرکز کے مجلدات کی موجودگی میں کتب خانوں کی حوصلہ شکن جستجو و تلاش سے بے نیاز ہو جائینگے۔ اردو دنیا اردو مرکز کی ان انمول اور بے پایاں خدمات کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اسی کے ساتھ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کی فرم بھی جو اردو لٹریچر کے اس بے بہا انتخاب پر پانی کی طرح اپنا روپیہ صرف کر رہی ہے۔ تمام ہی خواہان اردو کے شکریوں کی مستحق ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی

۱۸ جنوری ۱۹۲۸ء

لاہور میں "اُردو مرکز" کے نام سے ایک علمی اکاڈمی قائم ہوئی ہے جس نے اُردو ادب کی خدمت کو اپنے ذمے لیا ہے۔ اِس اکاڈمی کے اراکین یوپی اور پنجاب کے بعض سرگرم ادیب اور شاعر ہیں۔ اپنے دائرۂ عمل میں انہوں نے اُردو ادب کی اشاعت کے کام کو سب سے

زیادہ اہمیت دی ہے چنانچہ اسوقت زر کثیر کے صرف سے انہوں نے ایک سلسلہ کتابوں کا شائع کرایا ہے جنمیں اُردو نظم و نثر کا عمدہ انتخاب مندرج ہے۔ حصّۂ نظم کے سلسلے کا نام "پیامِ زندگی" ہے۔ اور اس سلسلے میں اب تک تیرہ جلدیں چھپی ہیں جن میں لکھنؤ کے مشہور اساتذہ کے مراثی کے اِنتخابات بلحاظ مضامین کئے گئے ہیں۔ حصّۂ نثر کا سلسلہ "منتخب افسانے" کے نام سے موسوم ہے جس میں گیارہ جلدیں طبع ہوئی ہیں۔ اور ان میں زبان اُردو کے مشہور اور مستند افسانہ نویسوں کے نتائج طبع درج ہیں۔ میری رائے میں اِس نظم و نثر کے انتخاب کرنے میں اراکین اُردو مرکز نے اپنی محنت اور عمدہ مذاق کا ثبوت دیا ہے۔ طباعت بھی اچھی ہے۔ اِن کا ارادہ ہے کہ آئندہ جو سلسلے شائع ہونگے ان میں اُردو ادب کے دوسرے شعبوں کے انتخابات درج ہوں گے حتّٰی کہ علوم طبیعی اور فلسفی کو بھی شامل کیا جائے گا۔ میرے خیال میں یہ سلسلۂ کتب پبلک کیلئے مفید ثابت ہوگا۔ اور اُردو خواں نوجوانوں میں اُردو ادب کا اچھا اور صحیح مذاق پیدا کرے گا۔

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز جو اس سلسلۂ کتب کے پبلشر ہیں مستحق تحسین ہیں۔ کہ انہوں نے اشاعت کا سارا خرچ اپنے سر لیا ہے۔ اور اب تک وہ تیس جلدوں کی اشاعت میں (جیسا کہ ممبرانِ اردو مرکز کا بیان ہے) پچاس ہزار روپیہ کی خطیر رقم صرف کر چکے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی ایم اے ایل ایل ایم ایل ایل ڈی

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ کہ اُردو کی خدمت کے سلسلے میں اُردو مرکز قابل قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اس کی مساعی جمیلہ کا پہلا نتیجہ دو درجن سے زیادہ مجلّدات کی صورت میں پبلک کے سامنے آرہا ہے۔ اُردو مرکز کے اغراض کی پوری تفصیل اس کے چیف ایڈیٹر مولینا تاجور کے عالمانہ مقدمے میں درج ہے۔ جو ہر سلسلہ مجلدات کی پہلی جلد کے شروع میں درج کیا گیا ہے۔ مولینا نے موثر الفاظ میں دکھلایا ہے۔ کہ اُردو کی موجودہ حالت اس قدر گری ہوئی کیوں ہے اس حالت کی اصلاح کے لئے اُنھوں نے جو تجویز سوچی ہے۔ وہ ہر طرح قابلِ تعریف ہے۔

مَیں نے مختلف سلسلوں کی بعض کتابوں کا سرسری طور پر مطالعہ کیا ہے۔ منتخب افسانوں کے سلسلے میں گیارہ جلدیں تیار ہو چکی ہیں۔ ان میں مختلف مصنّفوں کے مختصر افسانے درج کئے گئے ہیں۔ اِس سلسلے کی پہلی جلد میں ایک مقدمہ از جناب کارکنانِ اُردو مرکز دیا گیا ہے۔ جس میں افسانہ نگاری کی تاریخ اور ہندوستان میں اِس فن کے نشو و ارتقا نیز اس کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انتخاب کے اصول اور طریقہ ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ کارکنانِ اُردو مرکز نے بہت محنت و جانفشانی سے موجودہ افسانہ نگاروں کی تصنیفات کا انتخاب ناظرین کیلئے مرتب کیا ہے میری ذاتی رائے میں اِنکا طریقہ ترتیب کسی قدر قابل غور ہے۔ مگر ہر ذمہ دار جماعت اپنے خاص اصول کے مطابق اپنی تالیفات کو ترتیب دے سکتی ہے۔ اور اس کے

اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نتیجہ قابلِ اطمینان پایا جاتا ہے۔ اکثر مصنفین کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں ✦

صنفِ مراثی میں آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِس سلسلہ کے شروع میں مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ اور مرثیہ کے عناصر ترکیبی پر مشتمل ایک مقدمہ درج ہے۔ ہر عنصر یا مضمون کے متعلق خاص خاص حصّے منتخب کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جلد شہادت حضرت امام حسینؑ کے متعلق دوسری اور تیسری حضرت عبّاس کے متعلق اور چوتھی اور پانچویں حضرت علی اکبر کے متعلق اور باقی تین جلدیں حضرات عون و محمدؑ اور حضرت حر کے متعلق مرتب ہو چکی ہیں ✦

ایک اور سلسلہ رباعیات کا ہے۔ جس کی پہلی جلد رباعیات رواں پر مشتمل ہے۔ اور کارکناں کا ارادہ ہے۔ کہ دوسرے شعرا کی رباعیات بھی پبلک کے سامنے پیش کی جائیں ✦

میری رائے میں اِن مختلف سلسلوں کی اشاعت سے اُردو کی بڑی خدمت سرانجام دی گئی ہے۔ انتخابات سے ناظرین میں اس امر کا میلان بھی پیدا ہوگا۔ کہ مختلف مصنّفین کی مکمّل تالیفات کا مطالعہ کیا جائے۔ اور اس طرح اُردو ادبیات کا پورا لطف اُٹھایا جائے۔ میری رائے میں اصل کتاب کا مطالعہ بہ مقابلہ انتخابات کے زیادہ پُر اثر ہوتا ہے ✦

مجھکو اس امر سے بھی نہایت مسرت ہوئی۔ کہ اِن مجلدات کے پبلشر زمیسرز عطر چند کپور اینڈ سنز نے ایک کافی سرمایہ اس کام پر صرف کیا ہے اگر ان کی حوصلہ افزائی ہوئی تو آیندہ اِن سے اُردو کی خدمت کے متعلق اور بہت کچھ امید ہو سکتی ہے ✦

ت ۔ پ ۸۹۱۶۴۳۱۸

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔ ۱/

22 OCT 1952			
2 FEB 1957			
21.10 '57			

(۹۹۴۳)

۸۹۱۵ ۱۸۳۴ ت - ب

جلد اول

پیامِ زندگی

22 OCT 1952 | H.y. Kun. 1st H.y.K.

2 FEB 1959

26.10.57 B.A. (ر.)
A. 30